رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

قیمت ۸؍

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان نیازی — نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عار)
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲-افسانے ۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشا عالم سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعرا پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عار علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعرا کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت عہر علاوہ محصول

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

نگار

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بہ وجہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

فروری کا رسالہ جنوری کے ساتھ شایع ہوا تھا

وہ حضرات جنھوں نے فروری کا رسالہ نہ پہونچنے کی شکایت کی ہے۔ ازراہ کرم جنوری کا رسالہ اُٹھا کر دیکھیں، اس کے ہر صفحہ پر اس کی صراحت موجود ہے۔ منیجر نگار

جلد ۳۹	فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۴۱ء	شمار ۳

ملاحظات ---------- ۲
کیا سیاروں تک پہونچنا ممکن ہے؟ ---------- ۹
دس سال بعد ---------- شنکر سروپ بھٹناگر ام۔اے ---------- ۱۷
اُردو زبان کا نیا رسم الخط ---------- محمود علی خاں بی۔اے ---------- ۲۴
فلسفۂ عُریانی ---------- بہمن سہراب جی سورتی ---------- ۳۷
مکتوبات نیاز ---------- ۴۱
نازی سپاہی کیونکر طیار کیا جاتا ہے؟ ---------- ۴۵
بیسویں صدی کا سب سے بڑا ساحر و شعبدہ باز ---------- ۴۷
ہوسٹل کے ایک گوشہ میں بیٹھکر ---------- نظیر حیدر ---------- ۵۱
دُنیائے سیاست کا ایک زبردست معمّہ ---------- ۵۳
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۶
میرے مضمون کی بعض غلطیاں ---------- م۔ا ---------- ۵۹
بچّوں کے لئے دماغی تفریح ---------- ۶۰
کشکول ---------- ۶۲
محبت ۔ شاد ۔ عدم ۔ جگر ---------- ۶۳

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد- ۳۹	مارچ سنہ ۴۱ء	شمار- ۳

ملاحظات

ہماری مشکلات

کاغذ کی گرانی و کمیابی اب صبر شکن حد تک پہونچ گئی ہے اور اس اثر کو انگریزی کے کامیاب جرائد و رسایل بھی محسوس کر رہے ہیں، ولایت میں تو خیر اس کا علاج آسان ہے کہ فوراً قیمت بڑھا دیتے ہیں کیونکہ وہاں کی صحافت انسان کی ضروریات زندگی میں شامل ہے اور پبلک نہایت خوشدلی کے ساتھ قیمت کے اضافہ کو گوارا کر لیتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں کیا ہو سکتا ہے۔ جہاں اخبار مفت دیکھنے کا بھی رواج ابتک عام نہیں ہوا۔

میں تو خیر ہر وقت یہی سوچتا رہتا ہوں۔ لیکن کسی وقت آپ بھی اس پر غور کیجئے۔ میں یقیناً یہ جسارت کبھی نہیں کر سکتا کہ قیمت میں اضافہ کر دوں، لیکن یہ عرض کرنا غالباً گناہ نہیں کہ کیا آپ کے حلقۂ احباب میں کوئی ایک کافر بھی ایسا نہیں جسے آپ نگار کی خریداری پر مایل کر سکیں ؟

نگار میں بعض تبدیلیاں

آپ اس مہینے کے نگار میں بعض صوری و معنوی تبدیلیاں ملاحظہ فرمائیں گے۔ باوجود گرانی کے بہ نسبت پہلے کے کاغذ بہتر استعمال کیا گیا ہے اور مسطر بجائے ۲۵ سطر کے ۲۸ سطر کر دیا گیا ہے، ترتیب میں بھی آپ نمایاں تنوع محسوس کریں گے اور ہلکی دماغی تفریح کا سامان بھی آپ کو اس میں نظر آئے گا۔

افسوس ہے کہ باب الاستفسار کے لئے اس مہینے جگہ نہ نکل سکی اور کچھ کتابیں بھی ریویو سے رہ گئیں، لیکن آیندہ مہینے اسکی تلافی کر دی جائیگی

مقالات ماہ مارچ

موجودہ جنگ کے متعلق علاوہ ملاحظات کے آپ کو دو مضمون اور نظر آئیں گے ایک میں روس اور جرمنی کے اندرونی تعلقات سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں بتایا گیا ہے کہ جرمنی کی فوج [illegible]یاں

کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے کتنی زبردست ہیں۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ اگر نازیت واقعی کوئی فتنہ ہے تو وہ اتنا بڑا فتنہ ہے جس کے مقابلہ کے لئے ہر اُس انسان کو طیار ہو جانا چاہئے، جو دُنیا میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔

نظیر حیدر صاحب کا مقالہ سوشلسٹ پر ایک طنزیہ تنقید کی حیثیت رکھتا ہے اور غور سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔

اُردو زبان کے نئے رسم خط پر مولوی محمود علی خاں صاحب کا مقالہ بڑے کام کی چیز ہے اور میں ممنون ہوں گا اگر قارئین نگار علٰحدہ علٰحدہ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

پہلا مضمون علمی ہے، لیکن علمی زبان میں نہیں اور نگار کی یہ خصوصیت کہ مشکل سے مشکل علمی مضامین کو وہ سہل سے سہل زبان میں پیش کرتا ہے، نئی نہیں۔ اسوقت تک نگار کے صفحات پر جتنے علمی مقالے شایع ہو چکے ہیں اگر اُن کو جمع کیجئے تو ایک دفتر طیار ہو جائے۔

ہوڈنی والا مضمون نیر نجات سے تعلق رکھتا ہے جس کا سلسلہ ابھی کئی مہینے تک جاری رہے گا۔

دماغی تفریح کا سلسلہ صرف بچوں کے لئے نہیں، بلکہ ہر اس شخص کے لئے ہے، جو زندگی کی اُلجھنوں سے گھبرا کر تھوڑی دیر اپنے دماغ کو سکون پہونچانا چاہتا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ تفریح بھی "تعطل دماغ" کی نہیں بلکہ اس سے دلچسپ کام لینے کی ہے۔

کشکول کا حصہ بھی ہلکے مطالعہ کی چیز ہے لیکن معلومات میں اضافہ کرنے والی، امید ہے کہ آیندہ یہ دونوں حصے نگار میں اکثر نظر آئیں گے۔

نظموں کے لئے صرف دو صفحے نکل سکے، لیکن بیکار نظموں یا غزلوں سے پُر نہیں کئے گئے۔ جناب محب عارفی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ وقت کی آواز ہے عقل و فہم کی آواز ہے، جس کو آج تو نہیں کل سنا جائے گا — کل — جب مذہبی تقشف اور دینی عصبیت عالم احتضار میں ہوں گے۔

جناب جگر بریلوی کی غزل ویسی ہی ہے جیسی ایک پختہ کار، کہنہ مشق شاعر کی ہونا چاہئے۔ اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی :-

نصیب سے مرے پہلو میں دل نکل آیا
وگرنہ دور بہت بارگاہ ہے تیری

جناب عدم کی نظم میں "ہست و بود" کا وہی جوش ہے جو عہدِ حاضر کی شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے اور جس کے حامل دو ہی چار ہیں۔

جناب شاد عارفی کا شعر "خوابگاہ پر" نقاشانہ شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔

آیندہ اشاعت سے ایک تاریخی مقالہ اودھ کی مشہور ملکہ "بادشاہ بیگم" کے سوانح حیات پر شایع ہونا شروع ہوگا جسکے مطالعہ سے تاریخ اودھ کی بعض بہت دلچسپ باتیں آپ کے سامنے آجائیں گی۔ اس کے علاوہ اور متعدد مفید و دلچسپ مقالے آپ کو اپریل کے نگار میں نظر آئیں گے۔

کچھ جنوری کے رسالہ کے متعلق

جنوری کے رسالہ میں جن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے کلام پر تفصیلی نقد و تبصرہ باقی ہے لیکن بجائے اس کے کہ اس خدمت کو صرف ایک شخص انجام دے، زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام ملک کے چار یا پانچ نقادوں کے سپرد کیا جائے، تاکہ علٰحدہ علٰحدہ وہ ہر شاعر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ میں نے نقادوں کا انتخاب کر کے خط و کتابت شروع کر دی ہے۔ اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو بڑا دلچسپ انتقادی مجموعہ ہاتھ آجائے گا۔ یہ تمام

مقالے میرے نوٹ کے ساتھ نگار ہی میں شایع ہوں گے اور ایک ہی ساتھ۔ تاریخ کا اعلان شاید میں اگلے مہینے کرسکوں۔

گوہر حسین صاحب کہاں ہیں

دسمبر کے نگار میں جناب گوہر حسین صاحب گوہر کی ایک نظم شایع ہوئی ہے، جس کو میرے ایک فاضل دوست نے اس قدر پسند کیا ہے کہ وہ اپنی تصانیف ان کی خدمت میں ہدیتاً پیش کرنا چاہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ جناب گوہر کا پتہ میرے پاس محفوظ نہ رہ سکا، اس لئے نگار کے ذریعہ سے میں اُن کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ ازراہ کرم وہ اپنے پتہ سے مطلع فرمائیں۔ ان کی نظم کو اہلِ نظر نے بہت پسند کیا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ اپنے افکار سے نگار کو محروم نہ رکھیں گے۔

رفتارِ جنگ

آج فروری کی ۲۸ ہے، اور ہر وقت اس خبر کے سننے کی توقع کی جاتی ہے کہ جرمنی کی فوجیں بلغاریا میں داخل ہوچکیں اور البانیہ میں یونان کے خلاف انھوں نے جنگ شروع کردی۔ لیکن یہ خبر ابھی آئے یا نہ آئے، جرمن فوجوں کا داخلہ یقیناً بلغاریا میں ہوچکا ہے اور انھوں نے یونان کی طرف بڑھنا شروع کردیا ہے۔

اس خبر کو کیوں اتنی اہمیت حاصل ہے اور اس واقعہ کا اثر جنگ پر کیا پڑے گا؟ یہ سوال اتنا اہم نہیں، جتنا یہ کہ اس سے پہلے جرمنی نے بلقان کی ریاستوں کو کیوں اُن کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور اب حالات میں وہ کیا تبدیلی پیدا ہوئی ہے کہ وہ پھر بلقان کی طرف متوجہ ہوا، اسی کے ساتھ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اٹلی کو مدد دینے میں کیوں اس نے دیر کی اور اب وہ کیوں اس پر آمادہ ہے۔

ان باتوں کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آپ بحرِ روم اور بلقانی ریاستوں کے موقف کو ذہن نشین کرلیں۔

یہ واقعہ ہے کہ پولینڈ فتح کرلینے کے بعد ہٹلر صلح کے لئے طیار تھا، لیکن برطانیہ نے اس کو منظور نہیں کیا، کیونکہ اسے یہ خبر تھی کہ فرانس اور ہالینڈ و بلجیم کی متفقہ قوت بھی جرمنی کا مقابلہ نہ کرسکے گی اور ناروے اور ڈنمارک پر بھی ہٹلر اسقدر آسانی سے قبضہ کرلیگا۔

اس کے بعد جب فلانڈرس میں اتحادی فوجوں کو شکست ہوئی اور فرانس نے ہتھیار ڈالدئے تو ہٹلر نے پھر صلح کی کوشش کی، لیکن اب برطانیہ کے سامنے خود اس کی بقا اور اس کے اقتدار کا سوال تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ صلح کی باتیں سب مکر و فریب کی باتیں ہیں اور اب اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ خود بھی اس طوفان میں کود پڑے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ جب تک انگلستان نے فرانس وغیرہ پر بھروسہ رکھا اس کے عزم و ارادہ میں وہ پختگی نہ پائی جاتی تھی جو نازیت کے سیلاب کا حریف بن سکتی، لیکن جب چاروں طرف سے امیدیں منقطع ہوگئیں، تمام سہارے ختم ہوگئے تو انگلستان چونکا اور اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ سوال اب صرف فتح و شکست نہیں بلکہ موت و زیست کا ہے، یعنی اگر برطانوی حکومت کو زندہ رہنا ہے تو نازیت کا فنا ہونا ضروری ہے اور سچ یہ ہے کہ جنگ کا رُخ برطانیہ کے اسی عزم و احساس کے ساتھ بدلنا شروع ہوگیا۔

اس میں شک نہیں کہ فرانس کی شکست تک برطانیہ بالکل لڑائی کے لئے طیار نہ تھا لیکن اس کے بعد اس کی طیاریوں کی رفتار اتنی تیز ہوگئی کہ چند مہینوں کے اندر برسوں کا کام پورا کیا گیا اور ہٹلر کو سمجھنا پڑا کہ اصل لڑائی وہ نہ تھی جو فرانس میں لڑی گئی بلکہ وہ ہے جو انگلستان کے سمندروں میں لڑی جائے گی۔

پھر روزانہ انگلستان کو عبور کرنے، فرانس کے ساحلوں سے سواحل انگلستان پر بمباری کرنے اور ہوائی جہازوں کے حملے سے انگلستان کی آبادی کو تباہ و برباد کرنے میں ہٹلر نے کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ اب لڑائی کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ وہ خاموش بیٹھ سکتا، کیونکہ اب اس پر بھی ہوائی حملے شروع ہوگئے تھے اور اس طرح بالکل پہلی مرتبہ اس نے

اپنے گلے میں بھی پھندا پڑتے ہوئے محسوس کیا۔

اب ہٹلر نے چاہا کہ برطانوی حکومت کے لئے کوئی اور محاذ بھی پیدا کرے، چنانچہ اس نے بحر روم میں اضطراب پیدا کرنا چاہا جو برطانوی حکومت کے لئے واقعی شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن یہ خدمت اس نے مسولینی کے سپرد کی اور یہ دوسری غلطی تھی جو ہٹلر سے سرزد ہوئی۔

بحر روم میں اٹلی کو جسقدر ناکامی ہوئی اور اس کے بعد یونان اور افریقہ میں جو حشر اس کا ہوا وہ سب کو معلوم ہے — ہٹلر کو اس کی مدد پہلے ہی کرنا چاہئے تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے کئی سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہٹلر جنرل گریزیانی کے اس جرم میں کہ وہ مہینوں افریقہ میں بیکار بیٹھا رہا۔ اٹلی سے انتقام بھی لینا چاہتا تھا، دوسرے یہ کہ اس دوران میں وہ وشی حکومت اور اسپین کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش میں مصروف تھا تاکہ انھیں دونوں حکومتوں کو سامنے رکھکر بحر روم اور نہر سویز پر حملہ کرے، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ یہ تھا سبب تاخیر کا۔ لیکن جب ہٹلر نے دیکھا کہ اٹلی کی شکست خود اس کے لئے بھی نقصان رساں ثابت ہو رہی ہے اور ریاستہائے بلقان اور اس کے مقبوضہ ممالک پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے تو وہ مجبور ہو گیا کہ اٹلی کی مدد کرے اور اسی لئے وہ بلغاریا کے راستہ سے یونان کی طرف بڑھنا چاہتا ہے تاکہ سالونیکا تک پہونچکر نہر سویز کے متوازی حملہ کا خط قایم کر دے۔

اس نے یہ کوشش بھی کی کہ اسپین کے راستہ سے جبرالٹر تک پہونچ جائے، لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ پہلے وہ وشی حکومت کو راضی کرتا یا فرانس کے باقی حصہ پر بھی قبضہ کر لیتا۔ فرانس کے باقی حصہ پر قبضہ کر لینا تو اس کے لئے مشکل نہ تھا، لیکن وہ ڈرتا ہے کہ مبادا اس سے وہاں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہو جائے جس کا سنبھالنا دشوار ہو اور اس لئے وہ جبرالٹر والی اسکیم میں ابتک کامیاب نہیں ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ بلقان میں آتش جنگ مشتعل کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ اس صورت میں روس کو اپنی غیر جانبدارانہ پالیسی بدلنا پڑے گی اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا رخ کیا ہو، لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ بغیر جنگ کئے ہوئے بلقان کی تمام ریاستوں پر چھا جائے اور یقیناً وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔ رومانیا پر تو اس نے روس کو بسر بیا اور بکووینا کا لقمۂ تر دیکر بہت پہلے ہی اپنا اثر جما لیا تھا اور ہنگری بھی جاپان کے ساتھ ساتھ جرمنی کے نیو آرڈر میں شریک ہو گیا تھا، لیکن بلغاریا رہ گیا تھا اور اب وہاں بھی اس کو پوری طرح درخور حاصل ہو گیا ہے۔

ترکی کا پوزیشن بلقان کے مسئلہ میں بیشک اہم ہے، لیکن باوجود اس کے کہ برطانیہ سے اس کے دوستانہ تعلقات پائے جاتے ہیں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جرمنی کے راستہ میں مزاحم ہوگا۔ جب تک یونان پر حملہ نہ ہوا تھا، ترکی کہتا تھا کہ یونان پر حملہ ہوتے ہی وہ میدان میں آجائے گا، لیکن جب اٹلی نے براہ البانیہ اس پر حملہ کیا تو ترکی حکومت نے کہا کہ یہ حملہ ہمارے اغراض کی راہ میں حایل نہیں، البتہ اگر بلغاریا کی راہ سے کسی نے یونان پر حملہ کیا تو وہ خاموش نہ بیٹھا رہے گا۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جسوقت بلغاریا میں جرمن افواج کے داخلہ کی اطلاع آتی ہے اسی کے ساتھ ہی ساتھ یہ خبر بھی سننے میں آتی ہے کہ بلغاریا اور ترکی کے درمیان ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ہو گیا ہے اور رومانیا ایک لاکھ ساٹھ ہزار ٹن پٹرول ترکی کو فراہم کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ بہ حالات موجودہ رومانیا یا بلغاریا سے ترکی کا کوئی معاہدہ کرنا گویا ہٹلر کے ساتھ دوستی کا عہد و پیمان کرنا ہے اور اسی لئے ترکی و بلغاریا کے معاہدہ کو امریکہ کے بعض اخبارات نے ہٹلر کی زبردست سیاسی کامیابی قرار دیا ہے۔

ہر چند اس کے بعد ہم کو یہ بھی بتایا گیا کہ اس معاہدہ کا اثر برطانیہ اور ترکی کے دوستانہ تعلقات پر نہ پڑے گا، لیکن مسٹر ایڈن کا

متصر ہوتے ہوئے ترکی جانا ضرور کچھ معنی رکھتا ہے اور یقیناً وہ یہی سمجھنے وہاں گئے ہیں کہ ترکی اور برطانیہ کے آیندہ تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی، جبکہ ترکی بلغاریا (گویا جرمنی) کے ساتھ دوستی رکھنا چاہتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ترکی کی پالیسی اس وقت بالکل روس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور روس فی الحال جرمنی سے بگاڑنا نہیں چاہتا، اس لئے ترکی کی طرف سے یہ توقع قایم کرنا کہ وہ جرمنی کے خلاف میدان میں آجائے گا درست نہیں۔ ہر چند ابھی تک ترکی کی طرف سے کوئی ایسا اعلان نہیں ہوا جس سے کوئی صحیح نتیجہ اخذ ہو سکے، لیکن حالات یہی بتاتے ہیں کہ ترکی کسی کی طرف سے جنگ کرنے پر آمادہ نہ ہوگا اور آخر وقت تک اپنی ناطرفداری پر قایم رہے گا۔

بعض کا خیال ہے کہ ترکی کی ناطرفداری کا ٹوٹنا ضروری ہے، کیونکہ جرمنی یونان کے بعد ترکی ہی پر حملہ کرے گا تاکہ وہ موصل و عراق کے چشموں پر قابض ہو سکے، لیکن ہمارے نزدیک یہ اندیشہ بہت ضعیف ہے، کیونکہ اس صورت میں روس بھی جرمنی کے خلاف ہو جائے گا اور فی الحال یہ جرمن اغراض کے منافی ہے۔

الغرض بہ حالات موجودہ یہ بالکل یقینی ہے کہ جرمنی یونان پر حملہ کرے گا اور اگر اس میں کامیاب ہوگیا تو نہر سویز کی ناکہ بندی آسانی سے ہو جائے گی۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب برطانیہ کی بحری، بری و ہوائی قوت کو منتشر کر دیا جائے اور اسی لئے آیندہ موسم بہار میں ایک سے زیادہ محاذ پر لڑائی ہونے کا اندیشہ ہے۔

اٹلی کی فوجوں کو ہٹلر برابر ابھار رہا ہے اور نہیں چاہتا کہ افریقہ کی جنگ ختم ہو جائے، کیونکہ اس طرح انگریزی فوجیں اس طرف الجھی رہیں گی اور وہاں سے کسی دوسرے محاذ پر نہ جا سکیں گی۔ جاپان نے ایشیا میں جو اقدام شروع کیا ہے اس کا مقصود بھی یہی ہے کہ برطانوی فوجیں مشرق میں بھی الجھی رہیں۔

ہٹلر نے اس کی بھی دھمکی دی ہے کہ وہ انگلستان پر زبردست حملہ کرنے والا ہے اور بحر اٹلانٹک میں بھی اپنی نئی آبدوز کشتیوں سے برطانوی ناکہ بندی کر دے گا، گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر ہٹلر نے وہی سب کچھ کیا جو کہتا ہے تو سواحل امریکہ سے لیکر جاپان تک لڑائی کی آگ پھیل جائے گی اور یقیناً برطانیہ کو کئی محاذ پر لڑنا پڑے گا۔

اب غور کیجئے کہ ان محاذوں میں سے کس محاذ پر کیا کیا امکانات نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اٹلانٹک میں جرمن آبدوزوں نے برطانیہ کے تجارتی جہازوں کو اسوقت تک بہت نقصان پہونچایا ہے، لیکن آیندہ یہ خطرہ بہت کم ہو جائے گا اگر امریکہ نے برطانیہ کو جہاز مہیا کر دئے انگلستان پر، رود بار کے ذریعہ سے حملہ کا خیال تو ہٹلر ترک کر چکا ہے اس لئے اب اس کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں یا تو وہ نہایت تیز و وسیع ہوائی حملہ کرے، یا غباروں کے ذریعہ سے وہاں اپنی فوج اتارے۔ (گیس کے استعمال کا بھی اندیشہ کیا جاتا ہے) لیکن ان دونوں میں کامیابی مشکل ہے اور برطانیہ پہلے سے ان تمام باتوں کا انتظام کر چکا ہے۔

اگر یونان پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا تو بحر روم کی سطح پر البتہ پھر ایکبار آگ کے شعلے بھڑکیں گے اور یہ آگ جلد نہ بجھے گی۔

افریقہ میں اٹلی قریب قریب اپنے تمام مقبوضات سے محروم کر دیا گیا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی غالباً اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

ہر چند جرمن ہوائی جہاز وہاں پہونچ گئے ہیں اور برطانوی اڈوں پر بمباری کر رہے ہیں لیکن برطانوی فوجوں کا اقدام برابر بڑھتا جا رہا ہے۔

افریقہ میں برطانوی کامیابی کا اثر نہ صرف بحر روم پر پڑے گا، بلکہ جبرالٹر پر بھی، کیونکہ اب اسپین پر ہٹلر زیادہ دباؤ نہ ڈال سکے گا اور جرمن فوجوں کو اسپین سے گزر کر جبرالٹر تک پہونچنے کی اجازت نہ ملے گی۔ اسی کے ساتھ فرانس کے مقبوضات افریقہ پر بھی جرمن دباؤ کم ہو جائے گا

اور وشی حکومت کو جرمن مطالبات رد کر دینے میں آسانی ہوگی، چنانچہ فرانس کی تازہ کینٹ میں لیوال کا نہ پایا جانا اور مارشل پیٹان کا ہٹلر کے مطالبات ماننے سے برابر انکار کرتے رہنا اس کا ثبوت ہے کہ بحر روم اور سواحل افریقہ کی آیندہ جنگ میں جرمنی کی کامیابی کا کسی کو یقین نہیں ہے

ہندوستان کے لئے سب سے زیادہ غور طلب مسئلہ جاپان کا ہے۔ کیونکہ جو سمجھوتا جرمنی اور جاپان کے درمیان ہوا ہے، اسکی رو سے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ جاپان برطانوی حکومت کے خلاف فوج کشی کرے۔ چنانچہ جزیرہ ہینن میں جاپانی بیڑے اور جاپانی ہوائی جہاز کافی تعداد میں جمع ہو چکے ہیں اور چین کے جنوب میں کئی بحری اور ہوائی مستقر جاپان نے حاصل کر لئے ہیں۔ ڈچ ایسٹ انڈیز سے اُسے پٹرول بھی مل رہا ہے اور فرانسیسی انڈوچائنا اور تھائی لینڈ کے درمیان جو سرحدی نزاع ہو رہی ہے اس سلسلہ میں بھی وہ ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل کرے گا۔ پھر اس میں بھی کلام نہیں کہ اس کی بحری و ہوائی طیاریاں بہت زیادہ ہیں، اور اگر لڑائی چھڑ گئی تو برما اور ہندوستان اس سے محفوظ نہ رہ سکے گا، لیکن جاپان کی کامیابی کی راہ میں دو چیزیں حائل ہیں۔ ایک یہ کہ اگر برطانیہ سے لڑائی چھڑ گئی تو امریکہ کو بھی مجبوراً شریک ہونا پڑیگا۔ کیونکہ امریکہ کے متعدد جزیرے بحرالکاہل میں پائے جاتے ہیں اور وہاں امریکہ کے بحری بیڑے کافی تعداد میں موجود ہیں، دوسری چیز روس اور جاپان کے ناخوشگوار تعلقات ہیں، جن کی بناء پر جاپان آزادی کے ساتھ اپنی ساری قوت بحرالکاہل میں صرف نہیں کر سکتا۔ لیکن سنا جاتا ہے جرمنی اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ روس اور جاپان کے درمیان کوئی سمجھوتا ہو جائے اور اگر اس میں کامیابی ہو گئی جو بالکل قرین قیاس ہے تو اس میں شک نہیں کہ جاپان نہایت خطرناک دشمن ثابت ہوگا، کیونکہ جاپان نے پچھلی نصف صدی میں جتنی قوت حاصل کی ہے، وہ ابھی تک کہیں صرف نہیں ہوئی۔ چین میں ابتک اس کے اُلجھے رہنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ لڑائی خشکی میں تھی۔ اور اگر فیصلہ کا انحصار سمندر میں ہوتا، تو کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

بہرحال باوجود اس کے کہ سنگاپور میں برطانوی طیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، آسٹریلیا بھی پوری طرح مقابلہ پر آمادہ ہے اور امریکہ کی بحری قوت بھی اس کے خلاف صرف ہوگی، جاپان کو شکست دینا اتنا آسان نہ ہوگا، جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔

جاپان کی دیرینہ تمنا ہے کہ وہ ایشیا پر حکمرانی کرے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس تمنا کے پورے ہونے کا کوئی وقت ہو سکتا ہے تو یہی ہے کیونکہ برطانیہ کو یورپ میں بھی ایک زبردست دشمن کے خلاف اپنی قوت صرف کرنا ہے اور اس سے وہ فایدہ اُٹھائے گا۔

جرمنی اور جاپان کے اتحاد میں اگر جاپان کا یہ فایدہ ہے کہ اس طرح ایشیا میں اس کے پھیلنے کے امکانات قوی ہو جاتے ہیں، تو جرمنی نے اپنے دو فایدے سوچے ہیں، ایک یہ کہ اس طرح برطانیہ کو بالکل علیحدہ علیحدہ دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا اور وہ اپنی پوری قوت سواحل انگلستان یا بحر روم پر صرف نہ کر سکے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر جاپان کو کامیابی حاصل ہو گئی تو روس پر بھی جرمنی کا دباؤ زیادہ بڑھ جائے گا اور یورپ کی طرف روس کی توقعات ختم ہو جائیں گی۔

امریکہ ابھی تک لڑائی میں شریک نہیں ہوا، لیکن اس نے برطانیہ کی طرفداری میں اسوقت تک جو کچھ کیا ہے یا آیندہ کرنے والا ہے، وہ شرکت ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکہ کا خیال ہے کہ اگر لڑائی میں جرمنی کی فتح ہو گئی تو امریکہ کی جمہوریت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی اور اسی لئے وہ برطانیہ کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔ اس غرض کے لئے پریسیڈنٹ روزولٹ نے امریکہ کی سینٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کیا ہے جس کی رو سے پریسیڈنٹ کو اختیار حاصل ہو جائے گا کہ وہ جب اور جس طرح چاہے اسباب حرب سے برطانیہ کی مدد کرے۔ ہر چند ابھی تک یہ قانون پاس نہیں ہوا لیکن بعض معمولی ترمیموں کے بعد یہ قانون پاس ہو جائے گا اور برطانیہ کو اس سے بڑی تقویت پہونچے گی۔ تاہم اگر امریکہ کو جاپان کے خلاف لڑنا پڑا تو غالباً اس امداد میں ضرور کچھ کمی ہو جائے گی، گو امریکہ کا کہنا یہی ہے کہ اس حال میں بھی یہ مدد برابر جاری

رہے گی۔

بہرحال اسوقت جو حالات سامنے ہیں، ان کو دیکھ کر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مارچ کے مہینے میں لڑائی کا زور شروع ہو جائے گا اور جرمنی، انگلستان، بحرِ روم اور بحرِ اٹلانٹک پر ایک ہی ساتھ حملہ کرے گا۔ انگلستان پر تو اس کا حملہ صرف ہوائی ہوگا۔ لیکن غالباً زیادہ سخت اور بہت زیادہ منظم۔ لیکن اٹلانٹک میں آبدوز کشتیاں اور ہوائی جہاز دونوں کام کریں گے۔ اس طرح بحرِ روم میں بھی پانی اور ہوا کی لڑائی ہوگی۔ افریقہ کی طرف جرمن افواج کا جانا قرینِ قیاس نہیں، لیکن یونان کی طرف بڑھنا یقین ہے اور اس طرح ممکن ہے کہ خشکی میں بھی برطانیہ اور جرمنی کا تصادم ہو جائے۔

ایشیا کی طرف جاپان کی پیشقدمی البتہ فی الحال یقینی نہیں ہے، ہمارا خیال ہے کہ جرمنی کے حملہ کرنے کے بعد جاپان چند دن دیکھے گا کہ لڑائی کا کیا ڈھنگ ہے اور اگر اس نے جرمنی کا پلّہ بھاری نہ دیکھا تو وہ اس آگ میں کودنے سے احتراز کرے گا، لیکن اگر اس نے برطانیہ کو دبتے ہوئے دیکھا تو بیشک وہ سنگاپور اور برما پر حملہ کر دے گا۔ امریکہ کے مقبوضات کو وہ حتی الامکان بالکل نہ چھیڑے گا، کیونکہ اس میں اُس کا کوئی فایدہ نہیں ہے، اور یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ امریکہ ضرور لڑائی میں شریک ہوگا۔

ترکی اور روس دونوں غیر جانبدار رہیں گے اور اگر کچھ دب جانے کے بعد بھی وہ لڑائی سے علٰحدہ رہ سکیں گے تو دب جائیں گے اٹلی کا وجود ایک کسرِ اعشاریہ سے زیادہ نہیں۔ نہ اب بلقانی مسایل میں اس کی آواز کو کوئی اہمیت حاصل ہے، نہ بحرِ روم کی سیاست میں۔ جزیرۂ سسلی وہ جرمنی کو دے ہی چکا ہے اور شاید سرزمین روما بھی اس کے پاس باقی نہ رہے، گو جرمنی اور اٹلی کے درمیان آج اتحاد پایا جاتا ہے، لیکن جرمنی ہمیشہ سے اٹلی کا دشمن رہا ہے اور اسی لئے اٹلی کی شکست اس کے لئے تکلیف دہ نہیں۔

اٹلی کا مستقبل بہرحال سخت تاریک ہے، کیونکہ اگر جرمنی کامیاب ہوا تو وہ اٹلی پر بھی قبضہ کر لیگا اور اگر برطانیہ کی جیت ہوئی تو اس کے تمام افریقی مقبوضات اور جزایر بحرِ روم ہاتھ سے نکل جائیں گے اور اس کی حیثیت ایک تیسرے درجہ کی سلطنت کی سی ہو جائیگی

اسوقت تک ہندوستان پر براہ راست اس جنگ کا کوئی اثر نہیں پڑا لیکن اگر جاپان و برطانیہ میں لڑائی چھڑ گئی تو ہم کو اقتصادی مشکلات کے ساتھ ساتھ اُن مصیبتوں کے مقابلہ کے لئے بھی طیار ہو جانا چاہئے جو دوسرے جنگ آزما ملکوں کی آبادی کو جھیلنا پڑ رہی ہیں۔

اس جنگ کے انجام پر دنیا کے مستقبل کا فیصلہ منحصر ہے اور اس فیصلہ کے لئے ہم کو ابھی کئی سال اور انتظار کرنا پڑے گا گو ہم میں سے بعض اس فیصلہ کُن وقت کے آنے سے پہلے ہی تباہ و برباد ہو چکے ہوں گے

طلسمِ عمل

اُردو زبان میں پہلی کتاب جس میں "نفسیات" کے اس راز کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان کیونکر کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یہ ترجمہ ہے مسٹر ڈیل کارنیگی کی اس مشہور کتاب کا جو شایع ہوتے ہی لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو گئی۔ ترجمہ اس قدر سلیس و سادہ ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے نفسیاتی حقایق کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک افسانہ کی دلچسپی اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب کو ایکبار شروع کرنا اسے ختم کر دینا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

منیجر نگار لکھنؤ

کیا سیاروں تک پہونچنا ممکن ہے؟

آپ نے آتشبازی کی چیزوں میں ایک چیز وہ بھی دیکھی ہوگی جو سیدھی آسمان کی طرف چلی جاتی ہے، اسے بان بھی کہتے ہیں اور ہوائی بھی۔ آج ہم آپ کو بتائیں گے کہ آیندہ انسان اپنی سیاحت و سفر کے لئے شاید اسی طریقہ کو پسند کریگا، خاصکر اُس وقت جب وہ زمین کی کشش سے دور نکل جانے کا ارادہ کرے۔

یہ ہم پہلے کسی اشاعت میں بتا چکے ہیں کہ زمین کے چاروں طرف ہوا کی بڑی موٹی تہ پائی جاتی ہے اور ہوائی جہازوں یا غباروں کے ذریعہ سے ہم اس تہ کی انتہائی حد تک پہونچ چکے ہیں۔ لیکن اس حد سے آگے گزر جانا صرف بان یا ہوائیوں کے ذریعہ سے ممکن ہے۔

بظاہر ایسی فضا میں اُڑنا یا سفر کرنا جہاں ہوا بالکل نہ پائی جائے، ناممکن سا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اُصول حرکت کے لحاظ سے کسی چیز کا آگے بڑھنا ممکن نہیں جب تک سامنے کوئی دوسری چیز ڈھکیلنے کے لئے موجود نہ ہو۔ یعنی اگر فضا میں ہوا نہیں ہے تو ہم کس چیز کو چیر پھاڑ کے آگے بڑھیں گے، لیکن ہوائیوں کے ذریعہ سے اُڑنے والے جہاز اس قسم کے طیار کئے گئے ہیں جو خلا میں اس طرح بہتر کام دیسکیں گے جیسے ہوا کی موٹی تہ کے اندر آج کل کے طیارے کام دیتے ہیں۔

اس قسم کے موٹر یا جہاز کو ایک تیز چلنے والی توپ سمجھنا چاہئے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ جب بندوق یا توپ سر کیجاتی ہے تو اس میں پیچھے کی طرف بھی ایک حرکت ہوتی ہے، جسے اصطلاح میں دھکا دینا کہتے ہیں۔ اگر کوئی بڑی توپ کسی پہیہ دار گاڑی پر رکھی ہو اور کسی چکنی سطح پر گاڑی کو رکھ کر یہ توپ سر کی جائے تو گاڑی بہت دور تک سرکتی چلی جائے گی۔ اسی طرح ایک بان کا منھ اگر اوپر کی طرف رکھ کر سر کیا جائے اور کوئی چیز اُسے روکنے والی نہ ہو تو وہ متعدد دھماکوں کے ساتھ اور آگے بڑھتا جائیگا اس قسم کے موٹروں اور توپ میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ توپ اپنے اندر سے گولا پھینکتی ہے اور بان والی موٹروں سے صرف گیس پیٹ پھٹ کر باہر آتی ہے۔

بان کا اوپر کی طرف چڑھنا اس لئے نہیں ہے کہ وہ ہوا کو چیر کر آگے بڑھتا ہے، بلکہ گیس کے دھماکے خود اس کو آگے بڑھاتے ہیں۔ آپ نے اگر ڈائنامیٹ کے ذریعہ سے چٹانوں کو اُڑاتے ہوئے دیکھا ہوگا تو آپ اس اُصول کو سمجھ جائیں گے جس اُصول پر بان گاڑی طیار کی جاتی ہے۔

یہ امر کہ بان گاڑی خلا میں زیادہ تیزی سے اوپر چڑھ سکتی ہے، صرف اس صدی کی ابتدا میں معلوم ہوا اور یہ بات سب سے پہلے ایک روسی انجینیر زیول کوسکی نے دریافت کی اور ایک کتاب اس موضوع پر شایع کی۔

جب ۱۹۰۳ء میں رائٹ برادرس نے سب سے پہلی مرتبہ ہوائی جہاز پر مٹھیا اڑان کی تھی، اسی وقت اس روسی انجنیر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہوائیوں کے ذریعہ سے فضا میں سفر کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ تجویز صرف نظریہ کی حیثیت رکھتی تھی اور کوئی عملی اسکیم نہ تھی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اسوقت ہوائی یا بان کی ایجاد کوئی نئی ایجاد تھی، کیونکہ اب سے ایک ہزار سال پہلے چین والے تیر مرکرتے وقت ہوائیوں سے مدد لیتے تھے اور پندرھویں صدی کی ابتدا میں خود یوروپ کے اندر بھی اس سے کام لیا گیا چنانچہ جب انگلستان نپولین سے جنگ کر رہا تھا تو اسی قسم کی ہوائیاں شہروں میں آگ لگانے کے لئے استعمال کی گئی تھیں اور ۱۸۰۶ء میں بولون (Boulogne) نے انھیں ہوائیوں کے حملہ کی وجہ سے اطاعت قبول کر لی تھی۔

اس قسم کے بان اُنیسویں صدی کے نصف تک برابر یوروپ میں طیار ہوتے رہے اور آلات حرب میں ان کا شمار ہوتا رہا، لیکن چونکہ یہ خود چلانے والے کے لئے بھی بہت خطرناک تھے اس لئے ان کا استعمال ترک کر دیا گیا اور ان کی جگہ پیچھے سے بھرنے والی بندوقیں ایجاد ہوئیں، لیکن سگنل دینے کے لئے پھر بھی ہوائیوں کا استعمال برابر ہوتا رہا۔

یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ایک روسی انجنیر نے سب سے پہلے اس قسم کی پرواز پر ایک کتاب شایع کی ہر چند پبلک نے اس سے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا، لیکن بعض سائنس دانوں نے اس پر عملی حیثیت سے غور کرنا شروع کیا یہاں تک کہ پچھلی بڑی لڑائی کے وقت تک تمام علمی رسالوں میں اس کا ذکر ہونے لگا۔ سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں کلارک یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر رابرٹ گوڈارڈ نے ایک کتاب شایع کی جس میں انھوں نے اپنے ذاتی تجربات کی تفصیل ظاہر کی تھی اور بتایا تھا کہ اس طریقہ سے چاند تک پہونچنا ناممکن نہیں ہے۔

۲۳ء میں آسٹریا کے پروفیسر ہرمن روبرتھ نے (جو گوڈارڈ کے تجربات سے بالکل ناواقف تھا) ایک کتاب شایع کی جس میں بتایا تھا کہ بان گاڑی کے ذریعہ سے ہم فضا کے بعض سیاروں تک پہونچ سکتے ہیں اور اس کے چار سال بعد اسکے ایک شاگرد میکس والیر نے ایک انجمن مواصلتِ سیارگان (Interplanetary Society) کے نام سے قایم کر دی۔

اس انجمن نے قایم ہوتے ہی عملی تجربے شروع کر دئے اور میکس والیر نے اوپل کمپنی کے مالک کو (جو جرمنی کا مشہور موٹر بنانے والا ہے) آمادہ کیا کہ وہ بان سے چلنے والا موٹر طیار کرے چنانچہ اس نے مارچ ۲۸ء میں بغیر انجن کا موٹر طیار کر کے بان یا ہوائیوں کے ذریعہ سے اسے برلن کے ایک میدان میں چلایا۔ اس کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ تھی۔

اس کے چند دن بعد ہی، جرمنی میں سب سے پہلا تجربہ فضا میں بلند ہونے کا کیا گیا اور ایک پھسلنے والی گاڑی کو بارود کی ہوائیوں کی مدد سے ایک میل کے فاصلہ تک لے گئے۔ اسی طرح ایک ریل کے ڈبہ کو بھی ۱۴۹ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے

پٹڑیوں پر دوڑایا گیا اور فروری ۱۹۲۹ء میں میکس ویلیر برف پر پھسلنے والی گاڑی کو ۲۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لے گیا لیکن اس کے بعد انھیں تجربوں میں وہ ہلاک ہوگیا اور یہ پہلی ہلاکت اس سلسلہ کی تھی۔

اسوقت تک کے تجربوں سے دو باتیں پوری طرح متحقق ہوگئیں، ایک یہ کہ بارود کی ہوائیاں اچھا کام نہیں دیتیں اور دوسرے یہ کہ پانی یا خشکی پر بان گاڑیاں زیادہ کامیاب نہیں ہوسکتیں بلکہ فضا میں ان سے اچھا کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ نظریہ کی حیثیت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ دو ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار پیدا کرنے کے لئے بان جہازوں سے زیادہ بان گاڑیاں زیادہ مناسب ہیں جن میں گردش کرنے والا دھرا لگا ہوتا ہے۔ البتہ فضا میں بہت لمبا فاصلہ طے کرنے کے لئے وہ زیادہ مناسب ہیں۔

بارودی ہوائیوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ نلکیوں کے اندر بارود دبا دبا کر بھر دی جاتی ہے اور اس لئے جب ان میں ایک مرتبہ آگ دیدی جاتی ہے تو پھر ہوائیوں کو اپنے قابو میں رکھنا ناممکن ہوجاتا ہے اور اُن کی قوت کو نہ گھٹایا جاسکتا ہے نہ بڑھایا جاسکتا ہے، لیکن رقیق ایندھن (Liquid fuels) مرضی کے مطابق کم یا زیادہ استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس طرح ہوائی پر قابو رہتا ہے۔ علاوہ اس کے بارودی ہوائی خطرناک بھی ہے چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے تجربہ میں تین آدمی اس سے ہلاک ہوگئے

رقیق ایندھن کے مسئلہ پر سب سے پہلے جرمنی کی انجمن مواصلت سیارگان نے غور کیا اور اس کے دو ممبروں نے پٹرول اور سیال آکسیجن سے ملاکر رقیق ایندھن طیار کیا جو بارود سے بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔ اول اول تو دو ہوائیاں دوران تجربہ میں پھٹ گئیں، لیکن تیسری ۱۵۰ فٹ کی بلندی تک پہونچی اور اس طرح اُصولاً اس کی آیندہ کامیابی کا یقین ہوگیا۔

اسی سال جب جرمنی میں یہ انجمن قایم ہوئی فرانس میں بھی ایک سائنس داں نے اس فضائی سفر کے امکانات پر بحث کرکے ایک بڑے سرمایہ دار کو آمادہ کیا کہ وہ پانچ ہزار فرانک کا انعام ایک کامیاب تجربہ کرنے والے کے لئے مقرر کرے چنانچہ ۱۹۲۹ء میں سب سے پہلا انعام پروفیسر اوبرتھ نے حاصل کیا۔

۱۹۲۹ء کے ختم ہونے سے پہلے روس میں بھی دو انجمنیں اسی مقصد کی تکمیل کے لئے قایم ہوچکی تھیں، جنھیں اب حکومت پوری مدد دے رہی ہے اور جو فضائی سیر کے امکانات پر غور کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر رابرٹ گوڈارڈ اپنی پہلی تصنیف شایع کرنے کے بعد غافل نہیں رہا بلکہ خاموشی سے اس مسئلہ پر غور کرتا رہا اور ۱۹۲۹ء میں سب سے پہلے اسی نے رقیق ایندھن کی ہوائی طیار کی جو ۹۰۰ فٹ کی بلندی پر پہونچکر پھٹ گئی۔ اس کے کچھ دن بعد ایک امریکن کروڑپتی نے ۲۰ ہزار پونڈ ڈاکٹر گوڈارڈ کو مزید تجربات کے لئے دئے اور وہ ان میں زیادہ قوت وہمت کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

۱۹۳۰ء میں نیویارک کے بعض شایقین نے بھی ایک سوسائٹی قایم کی اور جرمن اُصول پر اس نے تجربات شروع

کئے۔ اس سوسائٹی نے سب سے پہلے ۱۹۳۳ء میں ایک ہوائی طیار کی جو ۲۵ فٹ کی بلندی تک پہونچکر پھٹ گئی۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں انگلستان کے اندر بھی ایک سوسائٹی اسی مقصد کے ساتھ قایم ہوئی، لیکن اس کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ہوائی وزارت نے اس پر روپیہ و وقت صرف کرنا بیکار سمجھا۔ تاہم یہ تحریک انگلستان میں بھی ترقی کرتی رہی اور دوسرے ملکوں میں بھی اور اب یہ سوال سامنے آیا کہ کشش زمین کی حد سے باہر نکل جانے کے بعد کیا صورتیں سامنے آئیں گی۔

نظریہ کی حیثیت سے یہ بات علمی طور پر تسلیم ہو چکی تھی کہ اگر توپ کا گولہ ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پھینکنا ممکن ہو، تو وہ کشش زمین کے حدود سے باہر ہو کر ہمیشہ کے لئے فضا میں گم ہو جائے گا، لیکن ظاہر ہے کہ گولہ کے ذریعہ سے آدمی تو سفر نہیں کر سکتا کیونکہ اول تو وہ اتنی تیز رفتار کو برداشت نہیں کر سکتا اور دوسرے ہوا کی رگڑ سے خود گولہ اتنا گرم ہو جائے گا کہ اس کے ذریعہ سے کسی آدمی کا اتنی منزل کو طے کرنا ممکن ہے۔ اس لئے یہ بات طے ہو گئی کہ گولہ پھینکنے کے اصول کو سامنے رکھکر سیاحت فضا پر غور کرنا بیکار ہے۔ بلکہ کوئی مشین یا گاڑی ایسی طیار ہونا چاہئے جو خود اپنی قوت سے اوپر جائے اور جس کی رفتار پر قابو بھی حاصل ہو۔ ہر چند اس وقت تک کوئی ایندھن یا قوت ایسی معلوم نہیں ہوئی جو کسی بوجھ کو کشش زمین کی حد سے باہر لیجائے، لیکن علمی حیثیت سے اس کو ناممکن نہیں سمجھا جاتا اور مسٹر کلیٹر[1] کا بیان ہے کہ ایک بان جہاز ۲۰ ٹن وزن کا ایسا بنایا جا سکتا ہے جو چار آدمیوں کو کشش زمین سے باہر لیجا کر پھر واپس لے آسکتا ہے، لیکن ایسے جہاز کا وزن تمام ضروری سامان ملاکر ۹۶۰ ٹن ہو جائے گا اور دو کروڑ پونڈ سے کم صرف نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی رقم محض تجربہ کے لئے فراہم ہونا بہت مشکل ہے اور اس لئے فی الحال اس کا عملی تجربہ ممکن نہیں لیکن غالباً ایک دن ایسا آئے گا کہ کوئی خاص ایندھن ارزاں دستیاب ہو جائے گا اور انسان کی یہ تمنا پوری ہو کر رہے گی۔

اب آیئے اصولی طور پر چند باتوں پر غور کریں جو فضائی سیاح کے سامنے آسکتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ کشش زمین کی حد سے باہر نکلنے کے بعد کیا ہوگا۔ اس باب میں ماہرین کا خیال ہے کہ جب ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلکر بان جہاز کشش زمین کی حد سے باہر ہو جائے گا تو پھر خلا میں ہوا کی رگڑ نہ ہونے کی وجہ سے وہ برابر فضا میں آگے بڑھتا جائے گا یہاں تک کہ وہ چاند کی حد کشش میں آجائے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس باب میں ماہرین کی رائے یہ ہے کہ جسم انسانی اس رفتار کو بھی آسانی سے برداشت کر سکتا ہے، بشرطیکہ یہ رفتار آہستہ آہستہ بڑھے۔ چنانچہ جرمن ماہرین کا تجربہ بتاتا ہے کہ اگر ۸ منٹ کے اندر اس رفتار کو آہستہ آہستہ بڑھایا جائے تو انسان اس کو برداشت کر سکتا ہے۔

تیسرا سوال آفتاب کی گرمی کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب زمین کی فضائے قائمہ[1] (Stratosphere) سے بان جہاز گزر کر اوپر جائے گا تو وہاں کی برقی حدت رکھنے والی فضا سے کیونکر صحیح سلامت گزرے گا اس کے جواب میں ماہرین فن

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نگار اکتوبر ۱۹۴۰ء

کہتے ہیں کہ فضائے قائمہ سے اوپر بیشک مختلف قسم کی فضائیں پائی جاتی ہیں، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ فضائیں جہاز کو تباہ کر دیں گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زمین کے چاروں طرف ہوا کی جو تہ پائی جاتی ہے اس سے گزرنے کے بعد آفتاب کی گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور ممکن نہیں کہ جہاز کے مسافر اسے برداشت کر سکیں۔ اس کا جواب ماہرین یہ دیتے ہیں کہ جہاز کا وہ حصہ جو آفتاب کی طرف ہوگا بیشک بہت گرم ہو جائے گا اور مخالف سمت کا حصہ بہت سرد رہے گا، لیکن ایسی ترکیبیں معلوم ہو گئی ہیں جن سے جہاز کے اندر کا درجۂ حرارت معتدل رکھا جا سکتا ہے۔ جہاز کو دوہری دیوار کا بنا کر اس کے اندر سے اگر ہوا نکال لیجائے (جس طرح تھرماس طیار کئے جاتے ہیں) تو سردی اور گرمی دونوں کا اثر نہیں ہو سکتا۔

کرۂ زمین پر ٹوٹنے والے ستاروں کی برابر بارش ہوتی رہتی ہے، مگر چونکہ راستہ ہی میں وہ رگڑ کھا کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اس لئے زمین تک وہ پہونچتے بھی نہیں لیکن اگر انسان نے فضا میں زیادہ اونچا اڑنے کا ارادہ کیا تو ان سے مڈبھیڑ کا امکان ہے، اس خطرہ کے متعلق پرواز کرنے والوں کا خیال یہ ہے کہ اول تو فضا اتنی وسیع ہے کہ اس تصادم کا امکان حد درجہ ضعیف ہے اور اگر ہو بھی تو اس سے ڈر کر اس تجربہ کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

فضا کے سیاح کا احساسِ وزن، بہ نسبت کرۂ زمین کے سیاح کے مختلف ہوگا، جس وقت حالتِ سکون سے وہ ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار تک پہونچے گا تو وہ بہت ناگوار طور پر محسوس کرے گا کہ اس کا وزن بہت بڑھ گیا ہے، لیکن جونہی وہ کشش زمین کی حد سے باہر نکلے گا تو وزن کا احساس بالکل ختم ہو جائے گا۔

وزن بجائے خود کوئی چیز نہیں ہے۔ وزن نام صرف اُس کشش کا ہے جو مادی چیز کی طرف زمین میں پائی جاتی ہے اسلئے اگر زمین کی کشش سے ہم دور ہو جائیں تو پھر کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ البتہ اگر ہم کسی دوسرے سیارہ کی کشش کے اندر پہونچ جائیں گے تو ہم پھر وزن محسوس کرنے لگیں گے، لیکن اس وزن کا کم زیادہ ہونا، اس سیارہ کی کشش پر منحصر ہے چنانچہ جو چیز زمین پر ۱۲ پونڈ وزن کی سمجھی جاتی ہے وہ کرۂ مریخ میں دس پونڈ اور کرۂ قمر میں صرف دو پونڈ وزن کی رہجائے گی یعنی ایک فضائی سیاح کو کرۂ قمر سے بلند جانے کے لئے بہ نسبت زمین کے صرف ۱/۶ قوت کی ضرورت ہوگی۔

جس وقت بان جہاز کشش زمین کی حد سے نکل جائے گا تو پھر نیچے اوپر کا مفہوم بھی ختم ہو جائے گا اور ایک انسان جہاز سے باہر آنے کے بعد بھی جہاز کے ساتھ ہی ساتھ اُڑتا ہوا چلا جائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ فضا میں اسے یہ کیونکر معلوم ہوگا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور جس سیارہ تک وہ پہونچنا چاہتا ہے اس کا راستہ کس طرح متعین کیا جائے گا۔ بالکل ممکن ہے کہ وہ زمین کی کشش سے دور ہو کر کسی اور سیارہ کے دائرۂ گردش میں آکر خود بھی گھومنے لگے اور ابدالآباد تک گھومتا رہے۔ لیکن یہ سوال زیادہ اہم نہیں ہے کیونکہ نظام شمسی کے سیاروں کی رفتار و گردش کا حال پوری طرح معلوم ہو چکا ہے اور آلات ریاضی کی مدد سے فضائی

راستہ بہ آسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی سیاح فضا میں اُڑنے کا ارادہ کرے گا تو اس کو مہینوں انتظار کرنا پڑے گا تاکہ جس سیارہ تک وہ پہونچنا چاہتا ہے وہ دوران گردش میں مناسب مقام تک آجائے۔

فرض کیجئے کہ ہم مریخ جانے کا ارادہ کریں گے تو ہم کو دیکھنا ہوگا کہ وہ کب زمین سے زیادہ قریب ہوتا ہے چونکہ مریخ اور زمین دونوں مختلف رفتار سے آفتاب کے گرد گردش کر رہے ہیں اس لئے جب یہ آفتاب کے اِدھر اُدھر ایک خط پر ہوتے ہیں تو ان دونوں میں ۲۳۵ ملین میل کا فاصلہ ہو جاتا ہے، لیکن جب زمین، مریخ و آفتاب کے درمیان آجاتی ہے تو یہ فاصلہ صرف ۵۰ ملین میل کا رہجاتا ہے جو کم سے کم سو دن میں طے ہوگا اور اس لئے ظاہر ہے کہ اسوقت کے آنے سے پورے سو دن پہلے سیاح کو اپنا یہ سفر شروع کرنا پڑے گا اور مریخ پہونچنے کے بعد واپسی کے لئے پورے ۲۲½ مہینے انتظار کرنا پڑے گا، کیونکہ اتنی ہی مدت کے بعد یہ دونوں قریب تر فاصلہ پر آتے ہیں۔ کسی کُرے پر اُترنے کے لئے ضروری ہے کہ جہاز کی رفتار کو اس کُرہ کی رفتار کے مطابق گھٹایا بڑھایا جا سکے۔ چنانچہ مریخ پر اُترنے کے لئے اس رفتار کو ۵۴ ہزار میل فی گھنٹہ تک بڑھانا پڑے گا اور زہرہ پر اُترنے کے لئے ۸۱۲۰ میل فی گھنٹہ تک۔

فضائی سیاح کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ وقت کا ریکارڈ رکھے اور زمین پر کام دینے والی گھڑیاں فضا میں شاید بیکار ثابت ہوں گی۔ لیکن چونکہ لاسلکی مواصلت زمین اور جہاز کے درمیان قایم رہے گی اس لئے وقت کا حال زمین سے معلوم ہوتا رہے گا۔

ایک دقت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جہاز کسی کرہ پر اُترے گا کس طرح؟ جب جہاز کسی کرہ کی حدِ کشش میں آجائیگا تو وہ یقیناً اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔ اس کے متعلق بھی ماہرین کافی غور کر چکے ہیں۔ بعض کُرے (جن میں زمین اور زہرہ بھی شامل ہیں) ایسے ہیں جن کے چاروں طرف بہت کثیف فضا پائی جاتی ہے اور یہاں ایک جہاز کی رفتار کو متعدد چھتریوں کے ذریعہ سے کم کیا جا سکتا ہے، لیکن بعض کُرے (مثلاً مریخ) ایسے ہیں جن کی فضا بہت لطیف ہے اور چھتریوں کی مدد سے جہاز کی رفتار کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورتوں میں جہاز کو کرہ کی سمت کشش کے خلاف لیجانا پڑے گا، لیکن اس کے لئے اور زیادہ ایندھن کی ضرورت ہوگی اور ایندھن کی نسبت سے جہاز بھی بڑا بنانا پڑے گا۔

اس میں شک نہیں کہ فضا کی سیاحت کا مسئلہ صرف اس وجہ سے ابتک حل نہیں ہوا کہ فضا سے گزرنے اور کشش زمین پر قابو پانے کے لئے اسوقت تک کوئی مناسب ایندھن یا قوت دریافت نہیں ہوئی۔ امید کی جاتی ہے کہ کوئی کہربائی قوت ضرور ایسی دریافت ہوگی جو اس مشکل کو حل کر دے گی، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ اس کی بابت یہ تجویز پیش کی جا رہی ہے کہ فضا میں کوئی اسٹیشن ایسا قایم کیا جائے جہاں سے جہاز اپنا ایندھن بالکل اسی طرح حاصل کر لیا کریں جس طرح ریل کا انجن درمیانی اسٹیشنوں سے کوئلہ پانی حاصل کر لیتا ہے۔

یہ اسٹیشن، زمین سے ۶۰۰ میل کی بلندی پر واقع ہوگا اور ساڑھے چار میل فی سکنڈ کی رفتار سے زمین کے

ساتھ ساتھ گردش کرے گا۔ اس کے مصارف کا اندازہ ۲۰ لاکھ پونڈ کیا گیا ہے۔

ایک اسٹیشن اسی قسم کا چاند کی سطح پر بھی قایم کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ دوسرے دُور کے سیاروں کی طرف سفر کرنے والے سیاح یہاں سے راستہ میں ایندھن حاصل کر لیا کریں۔ چونکہ چاند کی کشش بہت کم ہے، اس لئے یہاں سے اور بلند جانے کے لئے بہ نسبت زمین کے صرف ۱/۶ قوت کی ضرورت ہوگی۔

اسی سلسلہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان چاند یا دوسرے سیاروں تک پہونچ سکا تو کیا اسے وہاں آثارِ حیات نظر آئیں گے؟ - سب سے پہلے چاند کو لیجئے، کیونکہ فضائی سیاحت میں غالباً سب سے پہلے چاند ہی کا سفر اختیار کیا جائے گا۔

چونکہ چاند خود اپنے محور پر گردش نہیں کرتا اس لئے اُس کا ایک رُخ جو سورج کی طرف رہتا ہے، ہمیشہ گرم و روشن رہتا ہے اور دوسرا تاریک و سرد۔ رصد گاہ ولسن سے جو تازہ ترین مشاہدے کئے گئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند کے روشن حصہ کی حرارت، ۲۱۶ درجے صفر سے اوپر ہے اور تاریک حصہ کا درجۂ حرارت صفر سے اتنا ہی نیچے گرا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی سخت گرمی اور سردی میں کوئی جاندار نہیں پایا جا سکتا اور نہ انسان اسے برداشت کر سکتا ہے، اس لئے چاند کے سیاحوں کو خاص قسم کا لباس استعمال کرنا پڑے گا جو چاند کی گرمی اور سردی دونوں کو معتدل بنا دے۔

چونکہ چاند کی سطح پر زیادہ تر آتش فشاں پہاڑوں کی راکھ پائی جاتی ہے، جس میں گرمی قبول کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے، اس لئے اس کی سطح کو کھود کر نیچے ایسا ڈپو بنایا جا سکتا ہے جو ایندھن فراہم کرنے والے اسٹیشن کا کام دے اور جس سے رصد گاہ کا کام بھی لیا جا سکے۔

یہ تو چاند کا حال ہوا، اب عطارد کو لیجئے۔ چونکہ یہ سورج سے بہت زیادہ قریب ہے اس لئے یہاں کا درجۂ حرارت ۷۰۰ ہے اور کسی جاندار کے پائے جانے کا امکان نہیں۔ علاوہ اس کے یہاں کوئی فضا بھی نہیں پائی جاتی۔ اس لئے عطارد کے سفر کا خیال کرنا بیکار ہے۔

مشتری، زحل، یورانوس، نپچون اور پلوٹو، سورج سے اتنی دور واقع ہیں کہ یہاں کا درجۂ حرارت سے صفر سے ۲۰۰ درجے نیچے گرا ہوا ہے، اس لئے یہاں بھی کوئی ذی حیات نہیں پایا جا سکتا، اب رہ گئے زہرہ اور مریخ اور انھیں دو سیاروں کی طرف جانے کا خیال ہو سکتا ہے۔

جسامت میں زہرہ بہت کچھ کرۂ زمین سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے چاروں طرف بادلوں کی موٹی موٹی تہیں پائی جاتی ہیں اور اس لئے ابتک یقینی طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ اپنے محور پر گردش کرتا ہے یا نہیں۔ تاہم غالب گمان یہی ہے کہ وہ ضرور گردش کرتا ہوگا اور اس لئے وہاں کا درجۂ حرارت صفر سے اوپر ۲۰ اور ۵۰ کے درمیان رہتا ہوگا جو زمین کے منطقۂ معتدلہ کے درجۂ حرارت کے برابر ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں کی فضا، زمین کی فضا کی طرح ہو اور انسان کے سانس لینے کے لئے آکسیجن بھی پائی جاتی ہو۔ وہاں کی سطح اور آبادی کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ زہرہ اپنے عہدِ طفلی میں ہے اور اسوقت وہ اس دور سے گزر رہا ہے جو کرۂ زمین پر اب سے ایک کرور سال قبل پایا جاتا تھا۔

مریخ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی عمر کی آخری منزل میں ہے اور رفتہ رفتہ وہاں کی فضا اور وہاں کا پانی دونوں ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ تاہم وہاں کی فضا یا ہوا اتنی پتلی نہیں ہوئی کہ انسان کو آکسیجن نہ مل سکے۔ وہاں کا ٹمپریچر کسی جگہ ستر درجے صفر سے اوپر رہتا ہے اور کہیں ۴۰ درجے صفر سے نیچے۔ گویا زمین کے مقابلہ میں گرمی وہاں بہت کم ہے، لیکن سردی بھی اتنی سخت نہیں کہ انسان برداشت نہ کر سکے۔

کچھ زمانہ قبل مریخ میں نہروں کا مشاہدہ کیا گیا تھا اور اس بناء پر کہا جاتا تھا کہ وہاں کی آبادی انسان ہی کی طرح ذہین ہے، لیکن اب اکثر لوگوں نے ان نہروں کے وجود سے انکار کر دیا ہے، اور مریخ کی آبادی کی طرف سے جو توقعات قایم ہوئی تھیں اب باقی نہیں رہیں۔

الغرض انسان ان سیاروں تک پہونچنے کی کوشش میں مصروف ہے، لیکن یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی یہ کوشش کب کامیاب ہوگی۔

مطبوعات طاق نسیان

بہترین انتقادی لٹریچر

خواب کی دنیا خواب کی دنیا کی وسعت سچ پوچھئے تو بیداری کی دنیا سے زیادہ ہے لیکن ہم کو اسوقت تک یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ اسکی نوعیت کیا ہے حقیقت کا علم کجا؟ ہر زمانہ اور ہر ملک میں لوگوں نے کوشش کی کہ خواب کیوں نظر آتے ہیں، ان کی علمی اور نفسیاتی یا روحانی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے اور تعبیر کوئی معنی رکھتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ انھیں سوچنے والوں میں سے ایک شخص سگمنڈ فرائیڈ بھی تھا۔ اسنے اپنی ساری عمر اسی تحقیق میں بسر کر دی اور آخر عمر میں ایک کتاب لکھ کر خود بھی اسی خواب کی دنیا میں چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ

الہامات شاد شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے، لیکن اگر آپ ان کے کلام کا انتخاب معہ ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے

قیمت علاوہ محصول ۸ر

اقبال کی شاعری یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، اقبال پر اردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔

قیمت علاوہ محصول دس آنے

منیجر نگار۔ لکھنؤ

دس سال بعد

میں نے کنول کو دس سال بعد دیکھا۔ میں اس کو پہچان نہ سکا۔ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ دس سال پہلے اس کا سانولا رنگ تھا۔ وہ سفید دھوتی پہنے گھر کے لمبے چوڑے صحن میں کام کرتی ہوئی پھرا کرتی تھی اور اس سادگی کے ساتھ اس کے چہرہ پر چلبلاپن بھی تھا۔ مگر اب اس کا رنگ نکھر آیا تھا اور دور سے بہ مشکل ہی کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ دس سال پہلے کی کنول ہے۔ ہاں اگر اس کے چہرہ کے خدوخال کو غور سے دیکھا جاتا تو خود دو دس برس پہلے کی کنول معلوم ہوتی۔ اس کی چال ڈھال میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا تھا۔ لیکن اس کے چہرہ پر پہلا سا چلبلاپن نہ تھا وہ اپنے بچہ کو سامنے بٹھائے کھاوٹوں سے کھلا رہی تھی۔

اب سے دس سال پہلے جب میں اس کے گھر آتا تھا تو ضرور کسی نہ کسی کھیل میں وہ مجھے لگا لیتی تھی، مجھ سے باتیں کرنے لگتی اور مجھے ایسا موقع ہی نہیں دیتی کہ میں کسی اور کے پاس بیٹھ جاؤں۔ مگر اب دس سال بعد جیسے ہی میں مکان کے اندر داخل ہوا کنول مجھے دیکھکر جھجکی — شاید اس نے مجھے پہچانا نہ ہو — اور پھر وہیں کی وہیں اپنے بچہ کو کھلونوں سے کھلاتی ہوئی بیٹھی رہی۔ کنول کی چچی نے مجھے البتہ پہچان لیا اور بولی:

"کب آئے؟"

"آج صبح آیا۔"

"صبح! تو شام کو یہاں کیوں آئے؟"

"دوپہر بھر سوتا رہا"

"یوں کہو نا کہ تم اب ہم سبوں کو بھول گئے!"

"واہ ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! — اگر بھول جاتا تو شام کبھی نہ آتا۔"

"تم دس مہینے کے تھے تب سے تم ہمارے یہاں آتے تھے۔"

"کب کی بات تم نے کہی! — بیس برس پہلے کی!!"

وہ چپ ہو گئیں! میرے سامنے کنول بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی پہلے پہل اسے ایک دم پہچان نہ سکا۔ وہ نیچی نگاہ کئے برابر بیٹھی رہی۔ گویا وہ مجھے جانتی ہی نہ تھی! چچی نے پھر بولنا شروع کیا۔

"کنول کو تم نے کب سے نہیں دیکھا ؟"

میں سوچنے لگا۔ وہ پھر بولی :

"کنول کی تو یاد ہوگی تمھیں !"

"ہاں ، ہاں یاد ہے۔ دس سال ہوگئے جب سے نہیں دیکھا، آجکل کہاں ہے ؟"

وہ ہنس پڑیں۔

"ارے یہ کیا ہے" انھوں نے کنول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ ہے کنول، میں تو پہچان نہ سکا !"

کنول نیچی نگاہ کئے ہوئے مسکرانے لگی۔

"تم ضرور ہم سب کو بھول گئے !"

"بھولا نہیں ! — مگر ہاں کنول نے بھی تو مجھے نہیں پہچانا !!"

کنول کچھ بھی نہ بولی۔ اگر وہ دس سال پہلے کی کنول ہوتی تو ضرور جھنجلا اُٹھتی۔ مگر اس کا کیا قصور ؟ اگر وہ بھول گئی تو میں بھی تو اسے بھول گیا تھا۔ کیا کبھی میں نے اسے یاد کیا ؟ اب اس کے سامنے آگیا تو یاد آگئی ورنہ میں تو اسے بھلا ہی چکا تھا، اب تک کسی اور ہی دُنیا میں کھویا ہوا اِدھر سے اُدھر بھٹک رہا تھا۔ میری نگاہ میں میری پچھلی زندگی کا نقشہ پھرنے لگا دس سال پہلے میں یہاں سے پڑھنے کے لئے چلا گیا تھا اور اس پڑھنے لکھنے کے زمانہ میں مجھے کتابوں کے مطالعہ کے سوا اور کسی سے کچھ غرض نہیں رہی تھی۔ صبح کو پانچ بجے اُٹھنا۔ کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ دس بجے اسکول یا کالج پہونچنا۔ شام کو وہاں سے آکر تھوڑی دیر سیر و تفریح کے بعد پھر کتابوں کا مطالعہ کرنا یہی رات دن کا شغل تھا۔ اور — جب ایم۔ اے میں آیا تو میری زندگی میں کسی نے آکر ہنگامہ برپا کر دیا۔ میری زندگی کی ہموار سطح پر سمندر کی لہریں سی آنے لگیں۔ میں پھر بھی ان لہروں کے اوپر خاموشی سے تیر رہا تھا۔ میرے ایم۔ اے کا امتحان ختم ہوگیا تھا اور میرے خالی دماغ میں صرف ایک خیال سمانے لگا — بیلا میرا نہ معلوم۔ کتنے دنوں سے انتظار کیا کرتی ہے۔ مگر میں تو ابتک ایک پتھر کی مانند کے تھا۔ میرے دماغ میں اس کا خیال ضرور آتا تھا مگر میں ایسے خیال کی زیادہ پروا نہ کرتا تھا۔ جب اس کی شادی مجھ سے طے ہوگئی تو وہ خیال جس کی میں زیادہ پروا نہ کرتا تھا دماغ میں جڑ پکڑنے لگا۔ مگر شادی سے پہلے ملازمت میرے لئے ضروری تھی اس لئے میں ایک اسکول میں ملازمت کرنے چلا گیا — تھوڑے دنوں کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری زندگی کے زبردستی دو ٹکڑے کر دئے گئے !! کیونکہ جو میرا انتظار کیا کرتی تھی وہ کسی اور کو سونپ دیگئی تھی ! میں نے امیدوں کی طرف سے منھ موڑ لیا۔ آرزوؤں کو اپنے دل سے نکال دیا۔ سال کے آخر میں ملازمت چھوڑ دی اور پچھلی باتوں کی یاد سے تنگ آکر کسی جگہ چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ نوکری کی۔ مگر اسے بھی چھوڑ کر وہیں چلا آیا جہاں میں نے دس برس پہلے اپنی زندگی گزاری تھی۔ اور یہاں آکر دس سال بعد کنول کو دیکھا۔

"تم شملے بھی تو گئے تھے ؟" چچی نے پوچھا۔

"ہاں - وہیں سے تو آرہا ہوں !"

"کیا چھٹی ہے ؟"

"نہیں نوکری چھوڑ کر چلا آیا۔"

"کیوں !"

"ایسے ہی !"

میں جھنجھلا رہا تھا مگر میں نے اپنی جھنجلاہٹ کو چھپایا۔ نوکری چھوڑنے کی کچھ وجہ بتائی اور پھر چپ ہو رہا۔ اب میری طبیعت یہاں بیٹھے بیٹھے اُچٹ گئی تھی۔ سورج بھی دنیا کے دوسرے حصہ میں اپنی روشنی پھیلانے جا رہا تھا، آسمان پر لال لال بادلوں کے ٹکڑے تیرنے لگے تھے۔ میں نے اُٹھکر چلنے کو کہا اور اپنے گھر واپس آگیا۔

دوسرا دن — میں کنول کے گھر جانے کو تیار ہوا۔ مگر قدم نہ اُٹھتے تھے۔ دل تو خرور چاہ رہا تھا لیکن کنول کی بے رُخی دیکھ کر ہمت نہ ہوتی تھی۔ پھر سوچا کہ شاید پہلے روز جھجک کی وجہ سے نہ بولی ہو۔ اور اب وہ یہ خیال کر رہی ہو کہ میں پہلے کی طرح روز آیا کروں گا۔ مگر پھر بھی میرے قدم نہ اُٹھ رہے تھے۔ کنول بھولی ہوئی یاد کی ایک تصویر معلوم ہوتی تھی اس کا چُپ چاپ بیٹھے رہنا، نہ ہنسنا نہ مسکرانا۔ نیچی نگاہ کئے ہوئے اپنے بچہ کو کھلونوں سے کھلاتے رہنا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ شاید وہ پُرانی باتوں کو اپنے دل سے بھلا چکی ہے ! اور بھول کیوں نہ جاتی ؟ میں اس کے لئے کر ہی کیا سکتا تھا۔ میرے پاس اس کے لئے تھا ہی کیا سوائے محبت کے اور کچھ نہیں تھا اور اب تو سونے سے پیلی ہو کر پھرتی ہوگی۔ بیسیوں نوکر خدمت کے لئے ہر وقت حاضر رہتے ہونگے ایسے میں وہ کیوں نہ کسی کو بھول جاوے !

میں بہت افسردہ ہو گیا۔ میں نے اپنے قدم موڑنے چاہے مگر پھر بھی میں چیونٹی کی طرح آگے کو رینگتا ہی گیا۔ شاید وہ خیال کر رہی ہو کہ میں پہلے کی طرح اب بھی روز اس کے گھر آیا کروں گا !!

میں کنول کے گھر پہونچ گیا۔ صحن میں بیٹھے ہوئے سب آپس میں بات چیت کر رہے تھے میں نے دروازہ کے اندر گھستے ہی کنول کی آواز سنی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ باتوں میں مشغول ہے۔ مگر جیسے ہی میں داخل ہوا تو سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ چچی نے مجھے اپنے ہی پاس بٹھا لیا۔ کنول نے مجھے دیکھا ضرور مگر کچھ نہیں بولی۔ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی چچی نے پھر اپنی وہی باتیں چھیڑ دیں جو میرے آنے سے پہلے کر رہی تھیں، مگر اب کنول کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل رہا تھا تھوڑی دیر میں وہ آہستہ آہستہ کھسک کر اپنے کمرہ کے اندر چلی گئی — کیا یہ وہی کنول ہے جس کے متعلق میں خیال کر رہا تھا کہ شاید وہ یہ سوچ رہی ہو کہ میں پہلے کی طرح اس کے گھر آیا کروں گا !! مجھ پر پھر وہی افسردگی چھانے لگی۔ میرا دل وہاں سے فوراً بھاگ جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر میں تو ابھی آیا تھا۔ اس لئے میں دل پر جبر کر کے بیٹھا رہا۔ لیکن چپ چاپ

کہاں تک بیٹھا رہتا۔ میں نے جانے کا ارادہ کیا تو چاچی نے ٹوک دیا۔

"ابھی کہاں چلے — بیٹھو"

"پھر آؤں گا"

"کیوں طبیعت نہیں لگتی؟"

—— میں نے کچھ جواب نہیں دیا ——

"تمھاری ماں کب آویں گی؟"

"معلوم نہیں!"

"ان کو بھی بلا لو — ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے"

"اگر میں یہاں رہا تو شاید آجائیں"

"تو کیا تم کہیں جاؤ گے؟"

"شاید جانا پڑے"

"کہاں؟"

"ٹھیک معلوم نہیں"

"نوکری پر؟" —— میں خاموش رہا۔

"اری کنول کہاں چلی گئی" چچی نے زور سے کہا۔

"آتی ہوں! اس نے اس نے اندر ہی سے کہا۔

"میں چلتا ہوں — پھر آؤں گا"

"آنا ضرور"

کنول کے آنے سے پہلے ہی چلدیا۔ میری طبیعت اب بہت بھاری ہوگئی تھی۔ میں یہاں پر رہنے آیا تھا مگر یہاں سے بھی طبیعت اُکتانے لگی۔ کہاں جاؤں؟ مگر اور کہیں جانے کا ٹھکانا ہی نہیں۔ میں گھر جاکر بیٹھ گیا اور روز کی طرح ناول پڑھنے لگا۔

اب میں کبھی اس کے گھر جاتا، کبھی نہ جاتا، کبھی کنول سامنے بیٹھی رہتی کبھی چلی جاتی۔ کبھی دوسروں سے میرے سامنے بھی بولتی رہتی کبھی خاموش رہتی۔

ایک دن صبح سات بجے کنول کا چھوٹا بھائی مجھے بُلانے آیا۔ چچی اندر چارپائی پر لیٹی ہوئی تھیں اور ان کے سرہانے کنول ان سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی۔

"کیا بات ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"بازار سے کچھ چیز منگانی ہیں۔ لادوگے ؟" چچی نے کہا۔

"ہاں۔ کیا کیا منگانا ہے ؟"

"کنول کو منگانا ہے مجھے تو کچھ نہیں !"

میں ان کے چیزیں بتانے کا انتظار کر رہا تھا۔ چچی کنول کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ میں نے بھی تھوڑی دیر بعد کنول کی شکل کی طرف دیکھا مگر جیسی بیٹھی تھی ویسی ہی بیٹھی رہی۔

"بتا دے نا ؟" چچی نے کہا۔

"تم جو منگاؤ منگالو۔ اور میری چیز بھی منگالو !"

"تو تو کیا کیا منگا دے گی، بتا دے !"

کنول نے چچی کی طرف منہ کر کے بتانا شروع کیا اور میں ہنسنے لگا۔

"کیوں ہنسے ؟" چچی نے پوچھا۔

"یوں ہی !" کنول مجھے ہنستا دیکھ کر سٹپٹا گئی اس نے اپنی چیزیں بتانا بند کر دیں !

"تم اپنی چیزیں بتائے جاؤ ——" میں نے کنول سے کہا اور میں نے اپنی ہنسی روک لی۔

"کیا بات تھی ؟"

"کچھ بات نہیں —— میں اس پر ہنس رہا تھا کہ کنول چیزیں منگائے گی مجھ سے اور بتا رہی تھی تم کو"۔ اس پر وہ بھی مسکرا دی

"اچھا کب لادوں ان چیزوں کو —— شام کو آؤں گا تو لیتا آؤں گا"

"انھیں جلدی لانا ؟" چچی نے کہا۔

"کیوں ؟"

کنول کو تصویر بنانی ہے۔ وہ اسے لینے آ رہے ہیں اور جانے سے پہلے ہی یہ تصویر بنانا چاہتی ہے"۔

"کیسی تصویر ؟"

"یہ روئی سے تصویر بنائے گی"

"لینے کب آ رہے ہیں ؟"

"دو روز بعد"

میں بازار سے سامان لیکر واپس آ رہا تھا اور خیال کر رہا تھا کہ پہلے بھی تو کنول مجھ سے اپنے لئے چیزیں منگایا کرتی تھی، لیکن اب کیوں نہیں منگاتی۔ میں اس کا کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکا اتنے میں گھر آ گیا اور چیزیں لاکر حاجی کو دیدیں،

"کیسی تصویر بنے گی"

"جب بن جائے گی تو تمھیں دکھا دیجائے گی!"

"روئی کی تصویر میرے سامنے بنوانا تاکہ میں بھی جان جاؤں"

"اچھا تمھارے سامنے بنالے گی"

میرے سامنے کنول نے ساری تصویر بنائی اور میں دیکھتا رہا میں خیال کر رہا تھا کہ اگر ہم آپس میں کچھ دنوں نہ ملیں تو کتنے بدل جاتے ہیں — میرا خیال اور دور چلا گیا۔ کیا بیلا بھی اتنی بدل گئی ہوگی۔ نہ معلوم اب کب ملیں۔ شاید اب ملنا بھی نہ ہو۔ تو کیا اس کے دل میں میری یاد پر گرد جمتی جائے گی۔ یہاں تک کہ گرد میں میری یاد بالکل ڈھک جائے گی! کیا ہم دونوں ایسے ہی اجنبی ہو جائیں گے جیسے کہ میں اور کنول ہو گئے ہیں! — میں وہاں سے اُٹھ کر گھر چلا آیا۔

کنول کے جانے کا دن تھا۔ میں اس کے گھر گیا تاکہ مل آؤں۔ گھر میں چاروں طرف بے رونقی سی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ آج چچی سے بات چیت بھی نہ کر رہی تھی۔ میں کمرہ کے اندر گیا۔ اس نے مجھ کو دیکھا اور پھر نیچی نگاہ کر لی۔

"کونسی گاڑی سے کنول دہلی جائے گی؟" میں نے چچی سے پوچھا۔

"رات کے آٹھ بجے والی گاڑی سے" اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد کنول کا شوہر بازار سے واپس آیا۔ میں نے اس کو دیکھا۔ کیا یہی کنول کا شوہر ہے؟ بالکل دبلا پتلا لمبا قد، لمبا چہرہ اور عمر قریب قریب چالیس سال کی!۔ کیا یہی کنول کا شوہر ہو سکتا ہے؟ اُس کنول کا جو کہ تندرست ہے جسکا رنگ صاف ہے اور جس کے چہرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابھی بیس بہاریں بھی نہیں دیکھیں۔

انھوں نے فوراً آکر حکم دیدیا کہ سامان چھ بجے سے پہلے تیار ہو جائے اور جو چیزیں بازار سے لائے تھے انھیں صندوق میں رکھنے کی ہدایت کی۔

کنول نے ان چیزوں کی طرف دیکھا اور اُٹھاتے اُٹھاتے رہ گئی۔ چچی نے کنول سے انکے رکھنے کو کہا۔ صندوق وہیں کمرہ میں رکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے ان چیزوں کو صندوق میں رکھا ویسے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ چچی سے آکر وہ چمٹ گئی۔ میرا دم سا گھٹنے لگا اور میں کمرہ کے باہر چلا گیا۔ بہت دیر برآمدہ میں ٹہلتا رہا اور کسی اُلجھن میں پھنسا رہا۔ اس کے بعد میں گھر واپس آگیا۔

دل اب بھی گھٹا جا رہا تھا۔ اب بھی میں اُلجھن میں پھنسا ہوا تھا۔ میں بغیر ملے چلا آیا تھا۔ کنول کے لئے میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا تھا۔ جیسے میرے ہونٹ سی دئے گئے ہوں۔ گلا بند ہو گیا ہو!! کنول کی دو لال لال آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں نگاہ کے سامنے اب بھی تھیں۔

میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اس کے دل کا حال آنکھوں میں جھلک آیا تھا۔ اس کا دل پانی بنکر آنکھوں سے نکل پڑا تھا

اس کا درد جو کہ اس کے دل میں تھا وہ آنسوؤں کی طرح بہہ رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو ہی بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ میں کتنی کمزور طبیعت کا ہوں۔ جب کنول نے میری طرف آنسوؤں بھری آنکھوں سے دیکھا تو میری زبان سے کیوں نہ کچھ نکلا۔ آسمان پر دھندلا پن چھایا جا رہا تھا۔ سات بجنے والے تھے۔ دہلی جانے والی گاڑی کا وقت قریب تھا۔ میں اس اُلجھن میں ٹہل رہا تھا کہ اسٹیشن جانا ٹھیک ہوگا یا نہیں۔ شاید بغیر ملے چلے آنے سے کنول کو کچھ بُرا لگا ہو۔ مجھکو اسٹیشن جانا چاہیئے ۔ کنول کو گاڑی کے ڈبے میں بٹھا دیا گیا تھا اور میں اس کے شوہر کے ساتھ اسٹیشن پر ٹہل رہا تھا۔ کنول اب بھی رو رہی تھی۔ اس کی سسکیوں کی آواز اب بھی میرے کان میں آ رہی تھی۔ میں جان کر ڈبے سے دور ٹہل رہا تھا اور اس کے شوہر کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا رہا تھا مگر در اصل باتیں کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی تھی۔ میں کنول کو رخصت کرنے آیا تھا۔ اتنے میں کنول کا چھوٹا بھائی میرے پاس آیا اور کہنے لگا:

"آپ کو بہن جی بلاتی ہیں!"

"مجھے؟ ۔"

"ہاں ۔۔ چلو ۔" اور وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے ڈبے کے پاس لے گیا۔

"کیا ہے کنول! ۔" میں نے اپنا ہاتھ کھڑکی پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب بھی کچھ نہیں بولی اور زیادہ رونے لگی۔

"روتی کیوں ہو ۔ رونے سے کیا ہوگا!" ۔۔ کنول نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا دل بھر آیا۔ میں تعجب کر رہا تھا کہ کیا یہ کنول وہی ہے جو دس برس پہلے تھی! اس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا: "لال!"

ارے! ۔ کنول مجھے اسی نام سے اب بھی پکار رہی ہے! ۔ اور یہ تو وہی کنول ہے جو دس برس پہلے تھی! ۔ وہ روتی رہی۔

"روؤ مت ۔" میں نے اس کے بھائی سے کہا: "تم ان کے پاس بیٹھو!"

میں نے چلنے کا ارادہ کیا۔ کھڑکی پر سے اپنا ہاتھ ہٹا رہا تھا کہ کنول نے پھر زور سے ہاتھ پکڑ لیا۔ میں پھر کھڑا ہو گیا۔ میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا ۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم بھول گئی ہو! ۔ مگر کیا تم بھولی نہیں؟! ۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ان ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے سامنے بیلا کی تصویر بھی پھرنے لگی۔ میں خیال کر رہا تھا کہ وہ بیلا جو میرا انتظار کیا کرتی تھی مگر جس کے لئے میرے پاس سوائے محبت کے کچھ نہیں تھا۔ کیا بھول گئی ہوگی ۔ وہ تو محلوں میں پھرتی ہوگی۔ سونے کے زیوروں سے لدی ہوگی۔ باندیاں خدمت کرتی ہوں گی۔ کیا وہ بھولی نہ ہوگی؟! مگر یاد کیا مٹ سکتی ہے؟ ۔۔ میرا ہاتھ کنول نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

"کیا ہے کنول! ۔"

"کبھی دہلی آنا ۔ لال! ۔" اس نے کہا۔

"آؤں گا ۔ ! ۔"

اور کنول نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

شنکر سروپ بھٹناگر ایم۔ اے

اُردو زبان کا نیا رسم الخط

موجودہ ابجد کی مختصر تاریخ

۱ - ابجد مصریوں نے ایجاد کی۔ قدیم مصری اپنے خیالات کا اظہار جانوروں اور دوسری چیزوں کی تصویروں سے کرتے تھے، ابجد کی شکلوں میں بھی اُنھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا، اس ابجد کو ہیرو گلیفی کہتے ہیں۔

۲- اِس خط کی تین قسمیں تھیں، مقدس ہیرو گلیفی اِس خط کا ہر حرف ایک تصویر تھا، اِس میں صرف مقدس اور مذہبی چیزیں لکھی جاتی تھیں۔ دوسرا خط ہیراطیقی تھا، اس میں پوری تصویر کا صرف ایک جزو لیا جاتا تھا، اِس خط میں عموماً سرکاری تحریریں لکھی جاتی تھیں، اور نسبتہً آسان تھا۔ تیسری قسم دیموطیقی تھی، یہ عام کتابت کا خط تھا، اور اول الذکر دونوں خطوں سے زیادہ آسان تھا۔ آگے چل کر دُنیا کے بہت سے رسم الخط اسی سے ماخوذ ہوئے، جن میں عربی بھی شامل ہے۔ عربی کی عام رائج صورت خط نسخ ہے۔ خطِ نسخ سے نستعلیق نکلا جس میں ہماری اُردو زبان آج کل لکھی جاتی ہے۔

۳- عربی خط کو ہیرو گلیفی سے موجودہ شکل اختیار کرنے میں فنیشی، آرامی، سطرنجیلی، نبطی اور حیری یا کوفی یہ پانچ منزلیں طے کرنی پڑیں، شکلوں کی تفصیل ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگی۔

	شکل	مصری مقدس ہیروگلیفی	مصری خاص ہیراطیقی	مصری عام دیموطیقی	فینیشی	آرامی	سطرنجیلی	نبطی	حیری یا کوفی	نسخ	نستعلیق
۱	ا									ا	ا
۲	ب	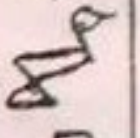	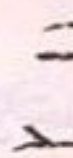							ب	ب
۳	ج	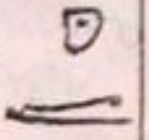								ج	ج
۴	د	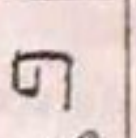	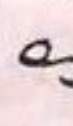							د	د
۵	ھ	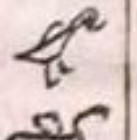								ھ ہ ہ ہ	ہ ہ ہ ھ
۶	و									و	و
۷	ز									ز	ز
۸	ح									ح	ح
۹	ط									ط	ط
۱۰	ی									ی یہ	ی یہ
۱۱	ك									ك ك ك	ك ك ك
۱۲	ل									ل	ل
۱۳	م									م م م	م م م
۱۴	ن									ن ن ن	ن ن ن
۱۵	س									س س س	س س س
۱۶	ع									ع ع ع	ع ع ع
۱۷	ف									ف ف ف	ف ف ف
۱۸	ص									ص ص ص	ص ص ص
۱۹	ق									ق ق ق	ق ق ق
۲۰	ر									ر ر	ر
۲۱	ش									ش ش ش	ش ش ش
۲۲	ت									ت ت	ت ت

(نوٹ) ث خ ذ ض ظ غ یہ حرف عربوں نے اپنے تلفظ کے اعتبار سے قریب المخرج حروف کی شکلوں میں تغیر کر کے بعد میں اضافہ کئے۔

۴۔ ظہورِ اسلام کے وقت عربوں میں حیری یا کوفی خط رائج تھا، جس میں نہ نقطے تھے اور نہ دوائر۔ اسی طرح حرکات یعنی زبر زیر پیش وغیرہ بھی نہ تھے، اسلام کے آنے پر جہاں اور علوم وفنون نے ترقی کی خط میں بھی ضروری اصلاحات اور خوبصورتی بڑھانے کے لئے تغیرات ہوئے۔ ابتدا میں قرآن پاک کے نسخے خط حیری یا کوفی میں لکھے گئے تھے، لیکن جب اسلام کا دائرہ وسیع ہوا اور دوسری قومیں بھی مشرفِ بہ اسلام ہوئیں تو محض سیاقِ عبارت سے عبارت پڑھنا ناممکن ہوگیا اور ضرورت پیش آئی کہ نقطے اور حرکات کی علامتیں بڑھائی جائیں۔ چنانچہ ابن مقلہ مشہور خطاط (۲۷۲ھ۔ ۳۲۸ھ) نے کوفی خط کو نسخ میں بدلا، زبر زیر اور پیش تشدید اور جزم وغیرہ کی علامتیں مقرر کیں، التباس دور کرنے کے لئے حرفوں پر نقطے لگائے۔

ایرانیوں نے نسخ میں مزید خوبصورتی پیدا کرکے نستعلیق نکالا، جس کو مسلمان ہندوستان میں لیکر آئے اور فارسی اور اُردو اس خط میں لکھی جانے لگی۔

فن کتابت کی تاریخ دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ہر عہد میں آسانی اور ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اصلاحات ہوتی چلی آئی ہیں۔ موجودہ زمانے میں سائنس کی ایجادات اور مشین کی کثرت نے ہر چیز کی رفتار کو تیز کر دیا ہے اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فایدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارا موجودہ رسم خط اِس غایت کے حصول سے قاصر ہے۔ اشکال کا پیچیدہ اختلاف، اور اُن کی کثرت، خط کی ترکیبی صورت۔ حرکات کا محض قیاس اور سیاقِ عبارت سے پڑھنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسی مشکلات ہیں جن کی وجہ سے اُس کی موجودہ صورت ٹائپ میں منتقل نہیں ہوسکتی بچوں کو پڑھانے میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، غیر زبان والے اُسے آسانی سے حاصل نہیں کرسکتے، بلاک کی تصویریں وغیرہ شایع نہیں ہوسکتیں اور پوری تحریر یا کتاب کے خط میں یکسانی ناممکن ہوتی ہے۔ خاصکر بالغوں کی تعلیم تو اِس رسم الخط کے ذریعہ سے کسی طرح ممکن نہیں۔

اِن تمام مشکلات کو دور کرنے کے لئے بہی خواہانِ اُردو کے پیشِ نظر ایک ایسے رسم الخط کی تجویز ہے جس کی وجہ سے یہ تمام مشکلات ختم ہوجائیں، اور ہماری زبان میدانِ ترقی میں اور زیادہ سرعت سے گامزن ہوکر دوسری زبانوں کا مقابلہ کرسکے، بلکہ اُن سے بھی آگے نکل جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے میں نے یہ رسم الخط تجویز کیا ہے۔

یہ رسم خط موجودہ رسم خط سے ماخوذ ہے، تمام حرفوں کی شکلیں حتی الامکان اصلی صورتوں کے مطابق رکھی گئی ہیں تاکہ اُس کے رائج کرنے میں کوئی مشکل پیدا نہ ہو اور خط میں بالکل انقلاب نہ ہوجائے، ٹائپ اور تحریر کی آسانی کے لئے اس کے حروف رومن کی طرح علٰحدہ علٰحدہ لکھے جاتے ہیں۔

موجودہ رسم خط میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں حرکات یعنی زیر زبر اور پیش کی علامتیں نہیں لگائی جاتیں، صرف محاورے، سیاقِ عبارت اور نظر کے عادی ہونے سے الفاظ صحیح حرکات کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ اِس لحاظ سے موجودہ رسم خط ایک قسم کا "شارٹ ہینڈ" ہے۔ میں نے اپنے رسم خط میں حرکات کی علامتیں حروف میں شامل کرکے حرف کا جزو بنادی ہیں اس تجویز سے انتہائی آسانی اور اختصار پیدا ہوگیا ہے، کوئی لفظ ہرگز غلط نہیں پڑھا جاسکتا، ایسا کرنے سے یہ رسم خط ہندی اور رومن سے بھی زیادہ آسان اور مختصر ہوگیا ہے۔ اس لئے کہ رومن میں حروف علت سے حرکات کا کام لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے لفظ لمبا ہوجاتا ہے، اور ہندی کی طوالت بھی ظاہر ہے اس لئے کہ اس میں حروف کو اپنی علامات کے ساتھ لکھنے میں قلم کو زیادہ گردش دینی پڑتی ہے۔

اِس رسم خط میں موجودہ رسم خط کا کوئی حرف ترک نہیں کیا گیا ہے تاکہ الفاظ کی اصلیت اور اُن کے عربی وفارسی وغیرہ کے ماخذ تلاش کرنے میں دقت نہ ہو، اگر ہم اپنی زبان سے ث س اور ص کی جگہ حرف س رکھ دیں اسی طرح ت اور ط کی جگہ صرف ت رکھیں، تو اردو زبان اُن زبانوں سے بالکل علٰحدہ ہوجائے گی جن کے الفاظ کثرت سے اس میں مستعمل ہیں، ان حروف کو برقرار رکھنے میں سب سے بڑی مصلحت یہی ہے کہ

اُردو کو اُن زبانوں سے قریبی تعلق رہے جن کے الفاظ سے اُس کا خزانہ مالا مال ہے۔

حروف کی شکلیں تجویز کرنے میں ٹائپ بنانے کی آسانی کو خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا ہے، یہ حروف ایسے ہیں کہ نہایت آسانی سے ان کا ٹائپ مختلف قسم کا تیار ہو سکتا ہے، رومن کی طرح ان حروف میں یہ سہولت ہے کہ یہ چھوٹے بڑے، لمبے، چپٹے، سیدھے ترچھے، غرض ہر طریقہ سے لکھے جا سکتے ہیں، ایک آرٹسٹ اپنے خیال کے مطابق ان کو جیسا چاہے لکھ سکتا ہے، یہ حروف اس پابندی سے بالکل آزاد ہیں کہ جیم کا دائرہ تین قط کا ہو اور بے گیارہ قط کی۔

جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں اس رسم خط میں حتی الامکان موجودہ حروف کی مشابہت قائم رکھی گئی ہے، البتہ ناگزیر صورتوں میں خفیف سی تبدیلی کر دی گئی ہے، جس کا بیان مختصر طور پر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱- ٹائپ کی آسانی، حرکات کی سہولت اور حرفوں کی یکسانیت کے لحاظ سے سوائے "ل" کے دائرے بالکل ترک کر دئے گئے ہیں، صرف حرفوں کے سروں سے کام لیا گیا ہے مثلاً:- ج ح س ص ع ق ن ہ

یہ حروف پہلی نظر میں معلوم ہو جاتے ہیں کہ یہ فلاں فلاں حرف ہیں۔

تمام حرفوں میں نیچے کی ڈنڈی حرکات کی علامتیں چسپاں کرنے کے لئے ہیں حرکات کی علامتیں یہ ہیں:-

ـَ ـِ ـُ مثلاً:- بَ جِ نُ ـں صِ قِ یِ بُ صُ جُ

ک کی صورت عربی کے ک کی طرح رکھی گئی ہے مگر حرکات کی آسانی کے لئے اُسے کھڑا اس طرح لکھا گیا ہے: کا۔

گ میں مرکز ہلالی صورت میں رکھا کے اوپر اس طرح لگایا گیا ہے: گا۔

ن غنہ میں بجائے نقطہ نہ لگانے کے اُس کے اوپر ایک ہلال بنا دیا گیا ہے: نں — واؤ معروف اور واؤ مجہول کا نام چھوٹا واؤ اور بڑا واؤ رکھا گیا ہے۔ واؤ مجہول کی علامت اُس کے اوپر ہلالی شکل میں اس طرح بنائی گئی ہے:- وٗ — یائے معروف اور یائے مجہول کا نام چھوٹی "ی" اور بڑی "ے" بدستور قایم رکھا گیا ہے۔ یائے مجہول کی علامت ہلالی شکل میں اس طرح رکھی گئی ہے:- یٗ

اُردو میں ایک خاص تلفظ واؤ مخلوط اور یائے مخلوط کا ہے، مثلاً بُوا، ہُوا، جُوا[1] اور کیا؟ کیوں؟ پیار اِن میں اور اِن کے مشابہ الفاظ میں واؤ اور یے کا تلفظ پورا نہیں بلکہ اُن کی آواز کمزور ہوتی ہے یا یوں کہئے کہ وہ آدھے پڑھے جاتے ہیں۔ اب تک اُردو میں اِن کی کوئی خاص علامت نہ تھی اور نہ میں نے اپنے رسم الخط میں رکھی تھی، لیکن جب میں نے اپنی تجویز مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو کو دکھائی تو انھوں نے اِس کمی کو محسوس کر کے اُس کی علامت یہ تجویز فرمائی کہ "واؤ مخلوط" اور "یائے مخلوط" کو ایک خط سے اس طرح کاٹ دیا جائے:- بُوا ہُوا کیوں۔

تشدید کی علامت علٰحدہ نہیں رکھی گئی ہے بلکہ مشدد حرف چونکہ دراصل دو حرف ہوتے ہیں پہلا ساکن اور دوسرا متحرک اس لئے بصورت تشدید حرف مکرر لکھ دیا جاتا ہے۔ مثلاً:- ملّت خشت

وہ عربی الفاظ جن کا الف لام ترکیبی صورت میں گر جاتا ہے یا صرف الف گر کر لام باقی رہتا ہے وہ بحذف الف لام یا الف تلفظ کے

---

[1] میں نہیں سمجھتا کہ اُردو میں "واؤ مخلوط" کا استعمال ہوتا ہے۔ بُوا اور ہُوا میں واو کی آواز کھلی ہوئی نکلتی ہے۔ نیاز

مطابق لکھے جاتے ہیں مثلاً:

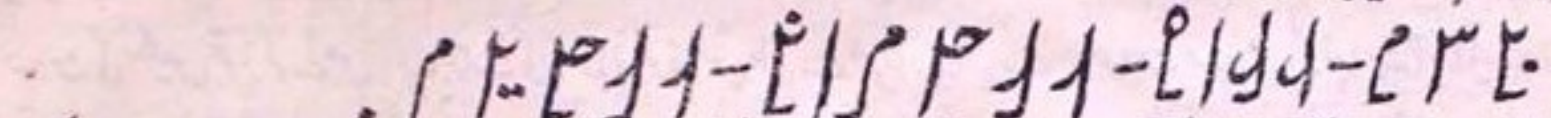

وہ انگریزی الفاظ جن کی ابتدا ساکن حرف سے ہوتی ہے مثلاً "سٹیشن" وہ بھی اس رسم الخط میں نہایت آسانی سے لکھے جا سکتے ہیں۔ پہلا حرف بلا علامت حرکت ساکن لکھا جائے اور باقی حروف اُس کے بعد حسب معمول لکھے جائیں مثلاً:- 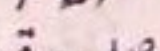 -

اِس رسم خط کے متعلق میرا دعویٰ ہے کہ اس سے زیادہ آسان، موجودہ ہندوستانی تلفظ پر حاوی اور اصل سے قریب تر دوسرا رسم الخط اُردو کے لئے تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ ابن مقلہ کی اصلاح کے پورے ایک ہزار سال کے بعد آج تائید خداوندی سے رسم الخط کی جو صورت میں پیش کرتا ہوں وہ ہر حیثیت سے مکمل اور موجودہ زمانے کی علمی ضرورت کے عین مطابق ہے۔

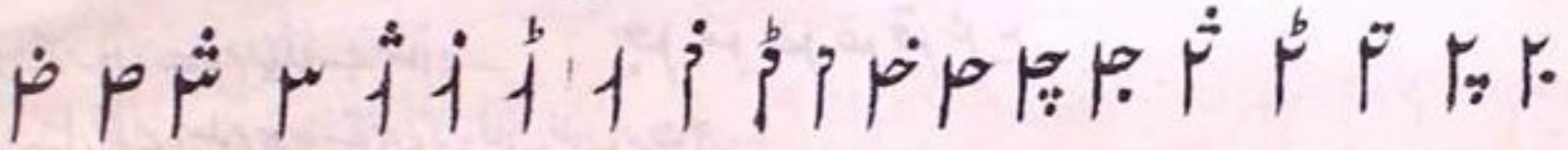

زبر

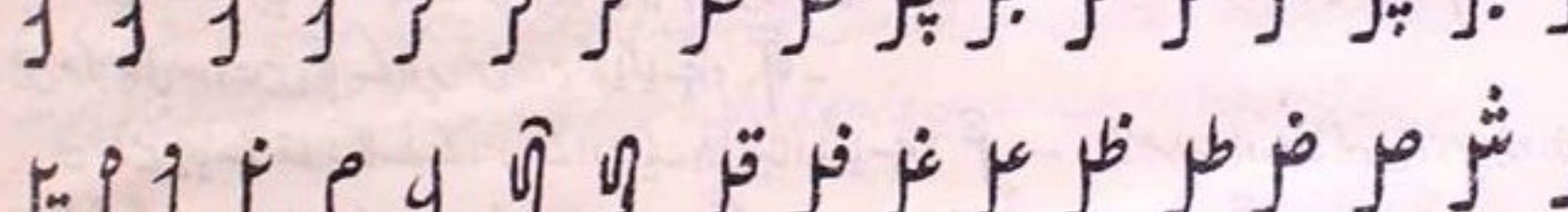

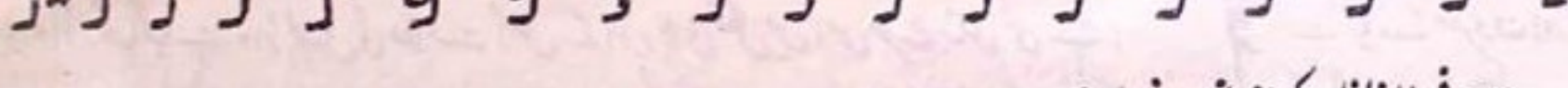

دوسرفی الفاظ کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

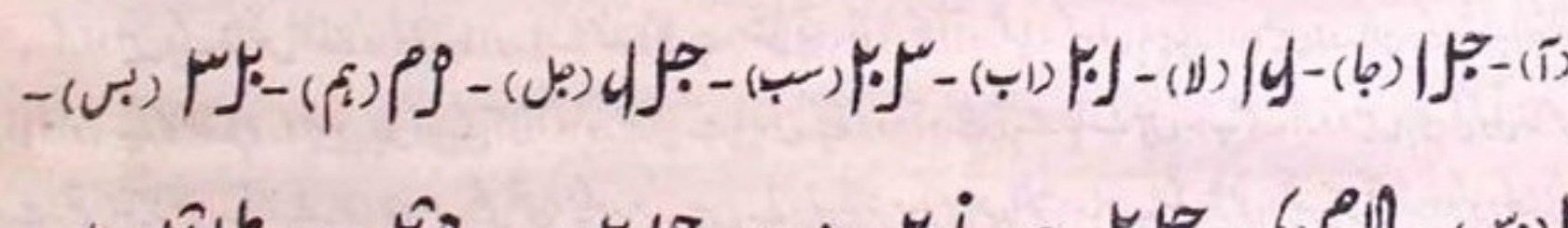

زیر

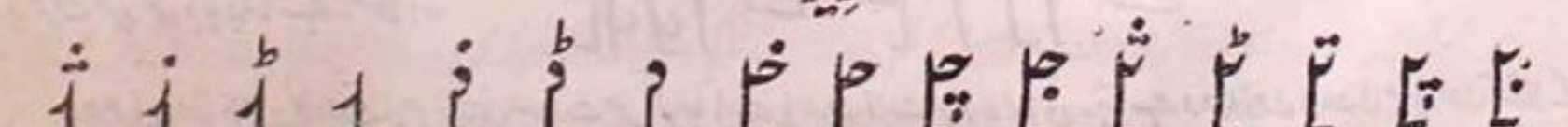

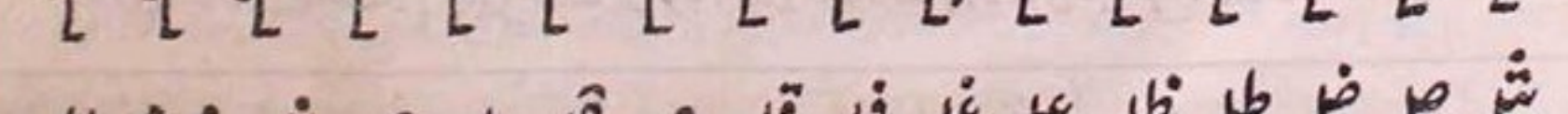

چند نمونے دو حرفی الفاظ کے ملاحظہ ہوں ؛

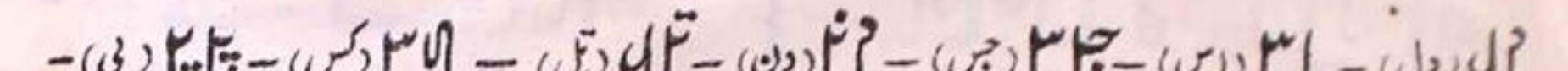

پیش

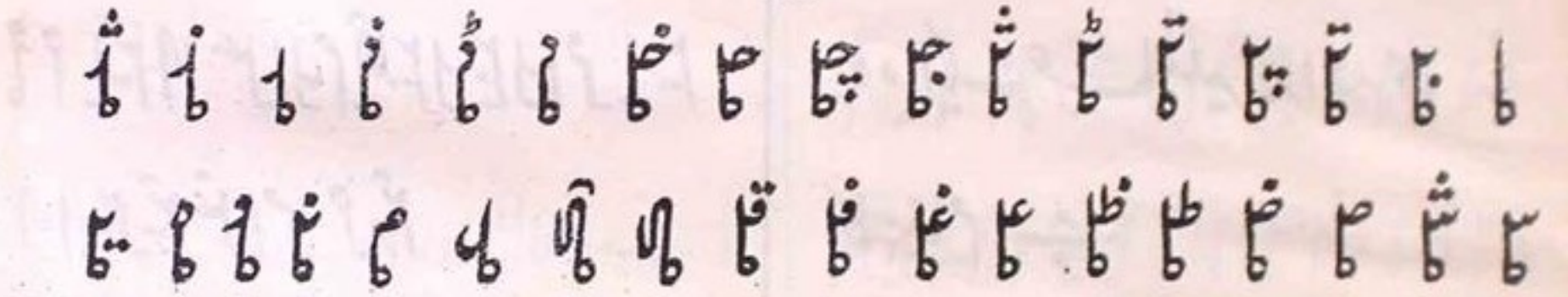

چند نمونے دو حرفی الفاظ کے ملاحظہ ہوں :-

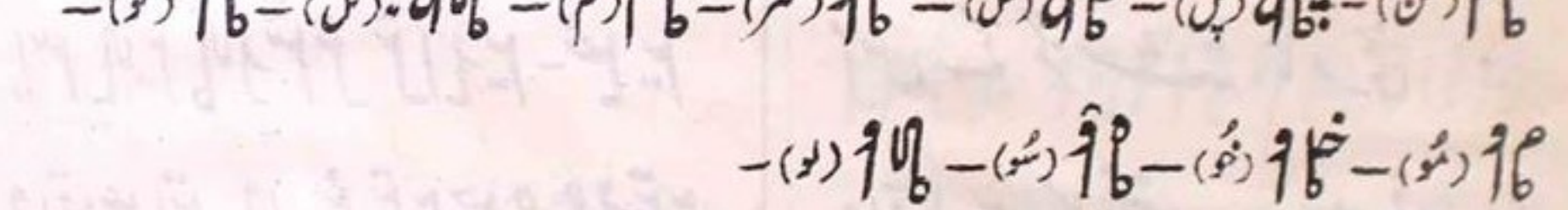

عبارت کے چند جُملے ملاحظہ ہوں :-

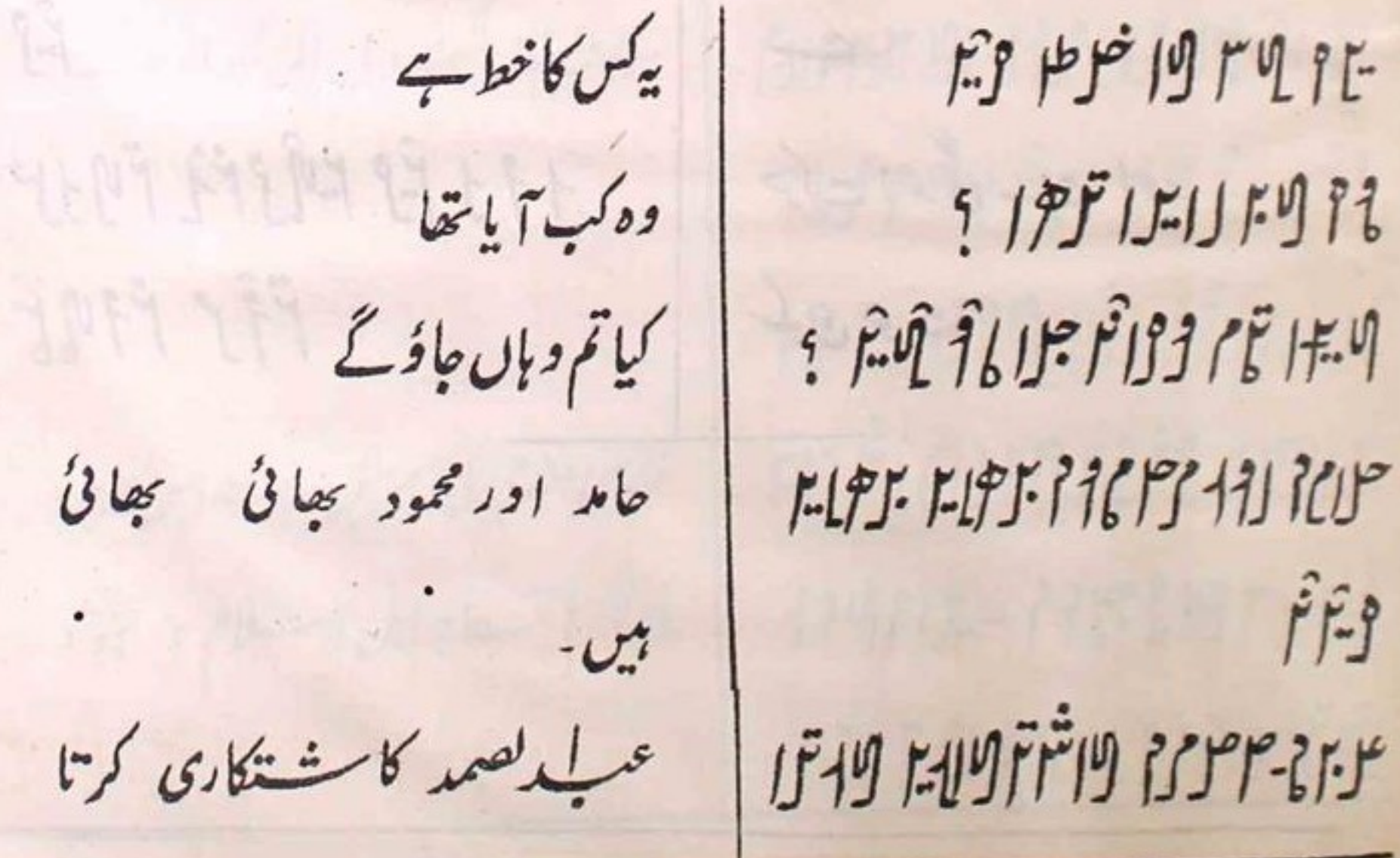

ہے۔

اسلام ایک بین الاقوامی

مذہب ہے۔

وہ ایک عالمگیر برادری

کا پیغام ہے۔

ہر قوم کی موجودہ حالت

اُس کے گزشتہ تاریخی

واقعات کا نتیجہ ہوتی

ہے۔

حرکت زندگی ہے اور

سکون موت

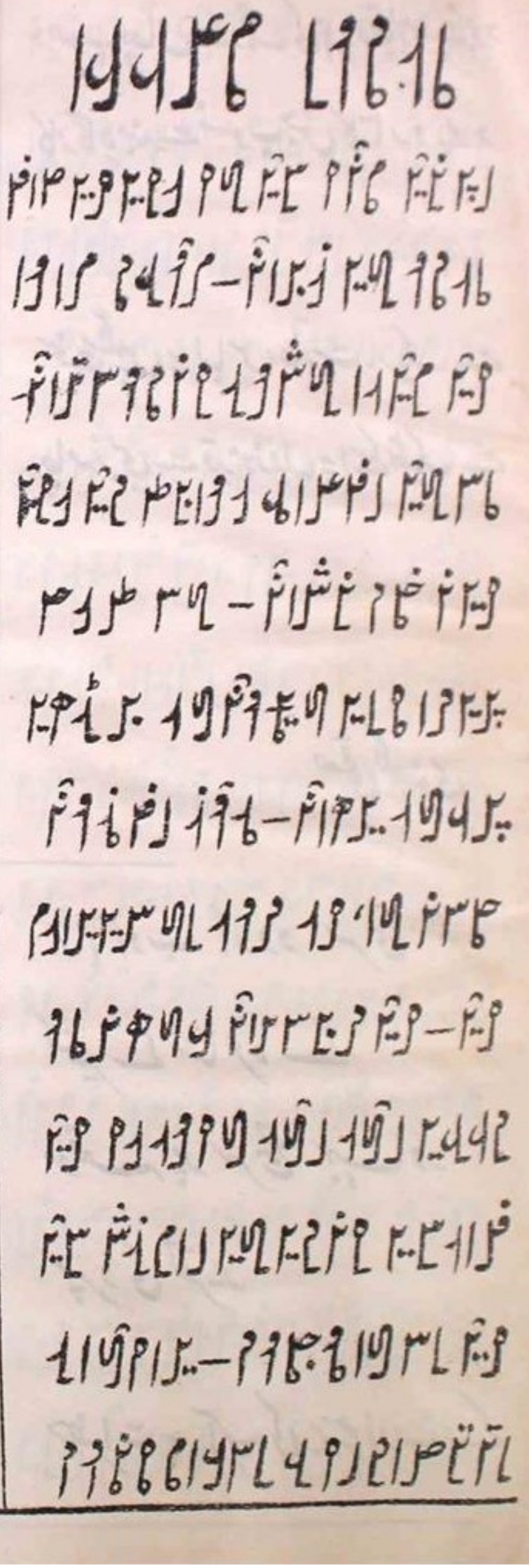

اُردوئے معلّٰی

اپنے منہ سے کہہ رہی ہے صاف اُردو کی زباں
مولد و ماوا ہے میرا کشور ہندوستاں

اُس کے افعال و روابط دے رہے ہیں خود نشاں
کس طرح پیدا ہوئی کیونکر بڑھی پل کر یہاں

روز افزوں حُسن کا ہر دور اک سیارہ ہے
ہے دبستاں لکھنؤ دلی اگر گہوارہ ہے

فارسی ہندی کی آمیزش سے ہے اس کا وجود
یادگارِ اتحادِ اہلِ اسلام و ہنود

دھوپ چھاں کے رنگ کی ہو وہ قبائے ہست و بود
کارگاہِ ہند سے منسوب جس کا تار و پود

سخت سنگیں یہ لباسِ عاریت باریک ہے
جامہ زیبی سے قدِ موزوں پہ اسکے ٹھیک ہے

صفی لکھنوی

بزم ادب اُردو سری نگر
کشمیر کے مشاعرہ کے
موقعہ پر سرتیج بہادر
سپرو کی تقریر

حضرات - آپ کی بزم ادب کے

اس جلسہ کی صدارت کا جو
اعزاز آپ نے مجھے بخشا
ہے میں اس کا تہ دل سے شکریہ
ادا کرتا ہوں - یہ تو میں
نہیں کہہ سکتا کہ میں شاعر
ہوں، البتہ یہ بات ضرور ہے
اور میں اس کا اقرار کرنے
کے لئے طیار ہوں کہ مجھے
اُردو فارسی سے دلچسپی
رہی ہے اور ہے - گو میں یہ
کہنے کے لئے طیار نہیں
ہوں کہ میں ہر کلام سمجھتا
ہوں مجھے بسخت افسوس ہے
کہ میں ہندوستان میں جہاں کئی

اور شور شین برپا ہیں وہاں
زبان کا مسئلہ بھی بیچ میں
گھسیٹ لیا گیا ہے۔
مجھے یہ کہنے میں مطلق
تامل نہیں کہ میں اُردو
زبان کا حامی ہوں اور اس
پیرانہ سالی میں بھی
اگر اُردو زبان کی کوئی
خدمت کرسکوں تو میں
اپنے لئے سعادت سمجھوں
گا۔ اگر کوئی زبان ایسی
ہے جو پشاور سے لیکر
سی پی اور بمبئی اور
مدراس کے بعض علاقوں

میں سمجھی جا سکتی

ہے تو وہ صرف اُردو ہے۔

محمود علی خاں بی۔ اے

(نگار) ہمارے فاضل دوست مولانا محمود علی خاں صاحب بھوپالی (بی۔ اے) نے اس رسم خط کو ایجاد کر کے اُردو تحریر کے مستقبل کو بہت شاندار بنا دیا ہے۔

ہمارا موجودہ رسم خط ایک طرح کی مختصر نویسی ہے جو یقیناً طباعت اور ٹائپ کے لئے موزوں نہیں اور اسی لئے حیدر آباد اور دہلی کے بعض حضرات کی کوششیں اس وقت تک بار آور ثابت نہیں ہوئیں۔

نستعلیق خط اس میں شک نہیں بڑا خوبصورت خط ہے لیکن شاید اس کی خوبصورتی ہی اس کے لئے بلائے جاں ہوگئی ہے کیونکہ اس کے دائرے اور جوڑ پیوند جن پر اس کی خوبصورتی منحصر ہے، ٹائپ کی مادیت کو برداشت نہیں کر سکتے اور اب طباعت کے اس دورِ ترقی میں اس خال نے مسہ کی بدنما صورت اختیار کر لی ہے۔

ہمارے فاضل مقالہ نگار نے اس جدید رسم خط میں دائرے اور جوڑ پیوند دونوں کو علٰحدہ کر دیا ہے، اس لئے ٹائپ کے بنانے میں زیادہ دقت باقی نہیں رہتی، البتہ ایک اشکال اب بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ حروف تہجی کی تعداد ۴۲ ہے ٹائپ کی کامیابی کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ کم سے کم حروف تہجی سے کام لیا جائے، کیونکہ جتنے حروف تہجی زیادہ ہوں گے اتنی ہی دیر ٹائپ جمانے میں ہوگی اور اس "دورِ برق و کہربا" میں دیر کا گزر نہیں۔

اس نقص کے دور کرنے کی صرف ایک صورت ہے، وہ یہ کہ رسم خط کو املا کی پابندی سے آزاد کیا جائے، یعنی صرف صوتی اصول پر حروف تہجی کی تعیین کی جائے، یعنی ث، ص، س میں سے صرف ایک حرف س کو لے لینا چاہئے۔

ز - ذ - ض - ظ میں سے ز کو

ت - ط، میں سے ت کو

ا - اور ع میں سے آ کو — اور

ح اور ہ میں سے ح کو

ژ کی کوئی ضرورت نہیں اور تی میں صرف ایک تی کافی ہے، بڑی چھوٹی کی تعیین کچھ نہیں۔ اس طرح گویا حروف تہجی حسب تفصیل ذیل صرف ۲۴ رہ جائیں گے۔

ا - ب - پ - ت - ٹ - ج - ح - خ - د - ڈ - ر - ز - س - ش - غ - ف - ق -

ک - گ - ل - م - ن - و - ی -

نون غنہ کے لئے ں کا نقطہ اُڑا دینا کافی ہوگا اور یائے مخلوطی کے لئے زیر، زبر، پیش کے علاوہ کچھ اور علامت مقرر کرنی پڑے گی۔ واؤ مخلوط کا استعمال ہماری زبان میں ہے نہیں۔

اب رہا حرکات یا اعراب کا سوال، سو اس کے لئے جو علامتیں ہمارے فاضل دوست نے متعین کی ہیں وہ اچھی ہیں، لیکن کھنچے ہوئے زیر اور کھنچے ہوئے پیش کے لئے کوئی علامت مقرر نہیں کی گئی۔ یعنی جس طرح ہندی میں زیر اور پیش کے لئے دو دو علامتیں (ि ी - ु ू) مقرر ہیں اسی طرح ہمارے رسم خط میں بھی ہونا چاہئے ا - و - اور - ی اُردو میں حروف علت ہیں اور ان سے حرکات کی تعیین بھی ہوتی ہے لیکن کھنچے ہوئے زیر اور پیش کی آواز کو ان کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کر سکتے۔

زیر کی ایک آواز تو معمولی ہوتی ہے جیسے بیٹا لیکن بٹیا میں یہ آواز زیادہ کھنچ جاتی ہے۔ اسی طرح گولا میں پیش کی آواز معمولی ہے لیکن بوٹا میں وہ زیادہ کھنچکر پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے موجودہ علامات میں بہت تھوڑا سا تغیر کرنا پڑے گا یعنی اگر معمولی زیر کے لئے یہ علامت (ـِ) مقرر کی جاتی ہے تو کھنچے ہوئے زیر کے لئے ـِـا مقرر کی جائے۔ اسی طرح معمولی پیش کے لئے نشان (ـُ) اور کھنچے ہوئے پیش کے لئے (ـُـو) مناسب ہوگا، اور اس صورت میں ہم بٹیا اور بوٹا کو یوں لکھیں گے:- ب ٹ ی ا — ب ٹ ُ و ا۔

اسی کے ساتھ میری رائے میں ایک اور ترمیم کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ دھ - ٹھ - بھ - گھ - پھ - جھ - چھ - ڈھ کا تلفظ بھی د - ٹ - ب - گ - پ - ج - چ اور ڈ ہی میں کچھ تغیر کرکے، پیدا کرنا چاہئے۔

مثلاً اگر آپ ب کو ب لکھتے ہیں تو بھ کو بھ لکھئے۔ اسی طرح دوسرے حرفوں میں بھی تغیر ہو سکتا ہے۔ ک کے لئے (ا) زیادہ ٹیڑھی کھیر ہے۔ میری رائے میں آ کافی ہے اور گ کے لئے (ا)

ہم کو جدید رسم خط میں تین باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ایک یہ کہ جہاں تک ممکن ہو حروف تہجی کو کم کیا جائے (اور یہ صرف املا کی پابندیوں کو اُٹھانے ہی کے بعد ممکن ہے) دوسرے یہ کہ علامات اعراب سے غلط پڑھنے کے امکان کو مٹا دیا جائے اور تیسرے یہ کہ لکھنے میں آسانی ہو۔

ہمارے فاضل دوست نے غلط پڑھنے کے امکان کو بہت کم کر دیا ہے اور اگر کھنچے ہوئے زیر و پیش کی علامتیں بھی بڑھا دی جائیں تو پھر یہ امکان بالکل باقی نہیں رہتا۔ حروف تہجی کی کمی کی طرف انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی اور شاید اسلئے کہ انھوں نے املا کی پابندیوں کو ضروری سمجھا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ لکھنے میں بھی آسانی ہے یا نہیں میں سمجھتا ہوں کہ مشق کے بعد یہ رسم خط مشکل نظر نہ آئے گا اور ٹائپ کے لئے تو وہ اس قدر موزوں ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر کوئی دوسرا خط تجویز ہو سکے۔

بہرحال ملک کو ممنون ہونا چاہئے کہ ہمارے معزز دوست نے رسم خط کی ایک نہایت خوبصورت، سلجھی ہوئی صورت پیدا کرکے ہماری تحریر کے بہت سے مشکلات کو دور کر دیا ہے اور اس طرح ہم ہر شخص کو اُردو تحریر سے بہت جلد آشنا کر سکتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ ارباب فکر اس موضوع پر غور فرمائیں گے اور اگر اُن کے نزدیک اس رسم خط میں کسی اور تغیر و تبدل کی ضرورت ہے تو اس سے بھی مطلع کریں گے۔

فلسفۂ عُریانی

یہ فلسفہ عہدِ حاضر کی پیداوار نہیں ہے اور نہ اس کا وجود کسی تازہ جسمانی یا روحانی انقلاب کا رہینِ منت ہے۔ بلکہ اب سے سیکڑوں سال پہلے یونان میں ہر شخص اپنے جسم کے تمام حصوں کا مظاہرہ آزادی سے عوام میں کر سکتا تھا۔ ارسطو، فلاطون، سقراط و بقراط کے زمانہ میں عریانی معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ برخلاف اس کے جو لوگ اپنے جسم پر چادر ڈال لیتے تھے انھیں شک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ کہیں یہ جلدی امراض میں تو مبتلا نہیں ہیں۔ پھر یہ حقیقت کہ عُریانی نے یونانیوں کی عام صحت اور جسمانی نمو کا معیار کس قدر اونچا کر دیا تھا وہ اُس زمانہ کے مجسموں سے ظاہر ہے، جن کی آج بھی قدر کی جاتی ہے۔ یونان میں ورزش کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کھُلی ہوا میں بالکل برہنہ ہو کر کھیل کود میں مصروف ہوتے تھے۔ (خود لفظ جمنیشیم (Gymnasium) کا ماخذ لفظ جمنوس (Gymnos) ہے جس کے معنے برہنہ ہونے کے ہیں) اور آجکل یورپ و امریکہ کے مرد و زن بھی اسی طرح سمندر کے کنارے اور کھُلے ہوئے مقامات پر نہایت باریک اور ہلکے لباس میں اپنے جسم کو خوبصورت و توانا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر ہم ہندوستان کی قدیم تاریخ کی چھان بین کریں تو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی عُریانی غیر مہذب نہیں تصور کی جاتی تھی بلکہ سوریہ نمسکار (Sun-Worship) کی شکل میں اسے مذہبی رسوم میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اسی سوریہ نمسکار کی برکت سے اس ملک نے والمکی اور ویاس جیسی ہستیوں کو پیدا کیا۔ اس سوریہ نمسکار کے فرحت بخش اثر کا نتیجہ تھا کہ سشروتہ (Sushruta) اور چرک (Charaq) جیسے شہرہ آفاق اطبا پیدا ہوئے۔ اسی سوریہ نمسکار کا نتیجہ تھا کہ یوگ (Yoga) کا فلسفہ وجود میں آیا اور یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے سائنس داں اس معمے کو آج تک حل نہ کر سکے کہ ایک لاغر و ناتواں شخص بالکل برہنہ حالت میں برسوں ہمالیہ کی چوٹیوں پر کیونکر زندگی بسر کر سکتا ہے اور کس طرح ایک ایسا شخص کئی اونس نائٹرک (زہر) بغیر کسی ضرر کے پی سکتا ہے۔

وہ حضرات جو عریانی کے مخالف ہیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس زمانہ میں ایک انسان بغیر کپڑوں کی مدد کے موسم کی سختیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس خیال کو دور کرنے کے لئے صرف ایک مثال کافی ہوگی اور وہ مثال ہندوستان کے سب سے مشہور سیاسی لیڈر مہاتما گاندھی کی ہے۔ مہاتما گاندھی کے بدن کو اگر مقررہ طبی اُصول کی رو سے دیکھا جائے تو غالباً اس کو تیسرے درجہ سے بہتر نہ سمجھا جائے گا۔ اسی کے ساتھ ہم اگر اس حقیقت کو بھی سامنے رکھیں کہ وہ فشار دموی میں مبتلا ہیں تو معلوم ہوگا کہ موسم کی سختیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے گاندھی جی سے زیادہ ناموزوں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ گاندھی جی نے جب سے صرف لنگوٹی پہننا اختیار کیا ہے اس وقت سے لیکر آج تک وہ نہ صرف اپنے جسمانی صحت کو برقرار رکھنے میں کامیاب ثابت ہوئے بلکہ اپنے دماغی تفوق کو بھی قایم رکھ سکے ہیں۔ ہندوستان کے غریب دیہاتی اپنی معاش و معاشرت کے لحاظ سے جتنے پیچھے ہیں، ظاہر ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بہت سے ایسے امراض سے محفوظ رہتے ہیں جو شہر کے لوگوں پر حملہ کرتے رہتے ہیں، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ گاؤں کے لوگ کپڑے کم پہنتے ہیں اور سورج کی روشنی سے زیادہ فایدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ سر پیٹرک منیسن، سر جوناتھن ہچنسن کا قول

نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جذام خاص طور پر نیم متمدن اقوام کا مرض ہے۔ ابتدائی اقوام کے افراد اس سے مستثنیٰ ہیں مگر جب ابتدائی اقوام کا ایک فرد کپڑے پہننا شروع کرتا ہے تو وہ اس مرض کا شکار بن جاتا ہے۔

مخالفین عریانی کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ عریانی مخرب اخلاق ہے۔ یہاں پر عریانی سے ان کا اصل مقصد نسلی عضو کا مظاہرہ ہے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ نسلی عضو کو جسم کے دوسرے اعضا سے علٰحدہ کرکے اُسے ایک مکروہ مفہوم میں استعمال کرنا کس حد تک درست ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے فرض کرلیں کہ انسان نسلی عضو کے ذریعہ سے معصیت کا مرتکب ہوسکتا ہے لیکن کیا اس کے یہ معنے ہوئے کہ وہ اپنے دوسرے اعضا کا غلط استعمال نہیں کرسکتا؟ یہ تو انسان کے بس کی بات ہے کہ وہ کسی عضو کا اچھا استعمال کرے یا بُرا لیکن محض کسی عضو کو چھپائے رکھنا اس کی ضمانت نہیں ہوسکتی کہ وہ اس کا بُرا استعمال نہ کریگا۔ اسی خام خیالی کی بنا پر ازمنۂ متوسط کے یورپین وحشیوں نے ایک قانون مرتب کیا تھا کہ جب عُریاں مجسموں کی نمائش کیجائے تو ان میں کے نسلی عضو کو توڑ دیا جائے اسی قسم کا قانون فنِ مصوری کے لئے بھی تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کے مشہور مصور جب عریاں اجسام کی تصاویر کھینچتے تھے تو ان میں سے نسلی عضو کو ظاہر نہیں کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی دیوانوں نے نسلی عضو کا دیکھنا ہی گناہِ عظیم قرار دیا۔ درانحالیکہ سوزاک اور آتشک ایسے امراض سے وہ بھی نہ بچتے تھے۔ انگلستان کے ادارۂ عریانی کے ایک مشہور رُکن مسٹر ولبی لکھتے ہیں کہ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ تحریک عریانی سے نہ انسان کے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے اور نہ جنسی خواہشات میں غیر معمولی ہیجان پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اگر انسانی اخلاق کا اندازہ پارچہ کی طوالت و دبازت سے ممکن ہوتا تو کپڑے بنانے کے کارخانے اخلاق سازی کے کارخانے بن جاتے اور خیاطی کی دوکانیں دنیا کے آگے اخلاق کے سب سے بہتر نمونے پیش کرتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی اخلاق کا واحد ضامن اس کی بہتر تعلیم و تربیت ہے اور عُریانی یا لباس سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

بہمن سہراب جی سورتی

(نگار) مقالہ نگار نے "عُریانی" پر ہر چند جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقتاً اُس سے بہت کم عُریاں ہے جو مغربی "ناتگوں" نے مستقل دفتر کی صورت میں دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اور یہ ایک علمی یا تحقیقی مقالہ کی حیثیت سے بھی قابل پیشکش چیز نہیں تو بھی یہ ذہنیت بجائے خود ایسی نہیں جس سے بے نیازانہ گزر جانا مناسب ہو۔

حیات انسانی سے متعلق کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا فیصلہ ہم انسانی فطرت کو نظر انداز کرکے کرسکیں اور سخت غلطی ہوگی اگر ہم فلسفۂ عریانی پر غور کرتے وقت، زندگی کی ان منزلوں کی طرف سے آنکھ بند کرلیں، جن سے انسان گزر چکا اور گزر رہا ہے۔

میں اس وقت تفصیل کے ساتھ حیات انسانی کی تاریخ پیش کرنا نہیں چاہتا، بلکہ صرف اس حد تک اسے بیان کروں گا جس کا ذکر "مقتضائے فطرت" کے لحاظ سے ضروری ہے۔ یہ امر غالباً کسی سے پوشیدہ نہیں کہ انسان کی موجودہ شکل و صورت اور معیشت و معاشرت کروروں سال کی تدریجی نشوونما کا نتیجہ ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ انسانی نشوونما ماحول کے اثرات کی دوسری صورت ہے، تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس وقت انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو ماحول یا فطرت کے اقتضاء کے خلاف سامنے آیا ہو۔

انسان کو آج درسِ عُریانی دیا جاتا ہے لیکن یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اولین دور کا انسان برہنہ ہی رہتا تھا، لیکن قدرت نے اسے برہنہ رہنے نہ دیا اور اپنا بدن ڈھکنے کے لئے وہ درخت کے پتوں اور جانوروں کی کھالوں سے کام لینے پر مجبور ہوگیا۔ پھر اگر

انسان صرف عریاں رہنے کے بعد ہی صحیح و توانا رہ سکتا ہے، تو کیا یہ قدرت کا ظلم نہ تھا کہ ماحول سے اثر پزیری انسان کی فطرت قرار دیدی اور اس طرح اسے ایک بیمار و ناتواں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔

اس سے غالباً مقالہ نگار کو بھی انکار نہ ہوگا کہ انسان کا اول اول جسم ڈھکنے کے ذرایع اختیار کرنا "معاشرتی عیاشی" نہ تھی بلکہ نتیجہ تھا مجبوری کا پھر جب صورت یہ ہے تو مقالہ نگار یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان عریاں رہنے ہی کے لئے پیدا ہوا تھا اور عُریانی ہی اس کی صحت و توانائی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ انسان سے زیادہ بیکساز آفرینش کسی مخلوق کی نہیں ہوئی۔ حیوانات ابتدا ہی سے وہ تمام چیزیں اپنے ساتھ رکھتے ہیں ہیں، جو بقاءِ حیات یا تنازع للبقا کے لئے ضروری ہیں۔ موٹی کھال، سخت بال، تیز ناخن، نکیلے سینگ، مضبوط دانت وغیرہ وغیرہ۔ لیکن انسان بالکل بے سر و سامان پیدا ہوتا ہے۔ البتہ عقل و دماغ کی صورت میں ایک ایسا رفیق اس کو دیدیا گیا ہے جو ہر قسم کی کمی کو پورا کر دیتا ہے اور انسان مجبور ہے کہ وہ اس رفیق سے کام لے۔ اس لئے ہم حیات انسانی کی جس منزل کی جستجو کریں گے، ہم کو قدم قدم پر اس کی عقل کی رہبری کے نقوش نظر آئیں گے اور یہی وہ چیز ہے جس نے انسان کو تمام دوسری مخلوقات پر حکمراں بنا دیا۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ملبوس کی ایجاد کوئی غیر فطری اقتضا تھا اور کیا انسان کو اس بات پر مجبور کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی عقل سے یوں جو چاہے کام لے، لیکن وضع ملبوس کی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ انسان کی معاشرت و معیشت نے عقل کے ساتھ ترقی کی ہے تو عریانی کو کبھی "دورِ عقل و فراست" کی چیز نہیں کہا جا سکتا۔

انسان "منطقی حیوان" ہے اور وہ مجبور ہے کہ قانون قدرت کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچے اور اس نتیجہ سے فایدہ بھی اُٹھائے۔ وہ اپنے ذہن و عقل کی طرف سے اس بات پر مُکلّف ہے کہ ہر بات پر غور کرے اور کائنات کے اُصول و روابط کو دیکھ کر اپنی دنیا دوسری مخلوق سے علٰحدہ قایم کرے اور اسی کا نام تہذیب و تمدن کی ترقی ہے اور یہی تمام اُن ایجادات و اختراعات کا باعث ہے جن پر آج انسان فخر کر رہا ہے۔

اگر واقعی عُریانی اچھی چیز ہے اور ملبوس صحت کے لئے نقصان رساں ہے، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ انسان ابتداءِ آفرینش سے غلطی میں مبتلا ہے اور اس غلطی نے اتنی ترقی کی کہ اگر آج دُنیا سے ان صنعتوں کو مٹا دیں جو کپڑے اور ملبوس سے متعلق ہیں، تو دنیا کی ساری رونق ختم ہو جائے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ دُنیا میں کوئی جھوٹی، غیر حقیقی یا نقصان رساں بات اتنے عرصہ تک قایم رہ سکتی اور اس حد تک ترقی کر سکتی ہے۔ مشہور ہے کہ ناقص چیز کی عمر زیادہ نہیں ہوتی اور وہی شے یہاں باقی رہتی ہے جو اصلح و احسن ہے، لیکن کسقدر حیرت کی بات ہے کہ ملبوس کا رواج باوجود ناقص و مُضر ہونے کے ابتک باقی ہے اور برابر اس میں ترقی ہو رہی ہے۔

مقالہ نگار نے شاید غور نہیں کیا کہ دُنیا میں بہت سی ایجادیں صرف صنعت پارچہ بافی کے وجہ سے ہوئیں اور اگر انسان برہنہ رہتا تو نہ صرف یہ کہ دُنیا کا تمدن ترقی نہ کرتا، بلکہ انسان کا ذہنی نشو و نما بھی موجودہ سطح سے بہت نیچے ہوتا اور قدرت کی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزیں بالکل بیکار رہتیں۔

مقالہ نگار نے گاؤں والوں کی صحت کا ذکر کرتے ہوئے صحیح استدلال سے کام نہیں لیا کیونکہ اول تو غریب دیہاتی "فلسفۂ عُریانی" کو جانتے ہی نہیں اور اگر انھیں کوئی سمجھائے بھی تو شاید وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ ننگا پھرنا کوئی معقول بات ہے۔ ان کی صحت اگر اچھی ہے تو صرف اس لئے کہ وہ محنت کرتے ہیں اور کھُلی ہوئی ہوا میں رہتے ہیں، نہ اس لئے کہ وہ ننگے رہتے ہیں یا کپڑا کم پہنتے ہیں۔

مقالہ نگار نے سوریہ نمسکار کے سلسلہ میں والمیکی اور ویاس کا ذکر کیا ہے درانحالیکہ یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ وہ ننگے رہتے تھے، لیکن اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ انکے فضل وکمال کا سرچشمہ صرف ان کی عریانی تھی، تو اُن ہزاروں انسانوں کے متعلق مقالہ نگار کیا کہیں گے جنھوں نے بغیر ننگے پھرے سیکڑوں مفید ایجادیں دُنیا کے سامنے پیش کردیں۔

کیا چین کا وہ شخص جس نے فن طباعت ایجاد کیا، ننگا رہتا تھا، کیا دوربین کا موجد گلیلو کپڑے نہ پہنتا تھا، کیا کونٹ زیلن نے ہوائی جہاز کی ایجاد حمام کے اندر ننگے ہوکر کی تھی اور کیا اڈیسن جب کوئی اختراع کرنا چاہتا تھا تو کوٹ پتلون اُتار دیا کرتا تھا۔

عریانی اور صحت کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کھلی ہوئی ہوا اور دھوپ میں اگر کپڑے اُتار کر ورزش کیجائے تو زیادہ مفید ہوسکتی ہے، لیکن اس سے فلسفۂ عریانی کی حقانیت کیونکر ثابت ہوسکتی ہے۔ ایک انسان ضرورتاً کپڑے بھی اُتار سکتا ہے، کسی وقت ننگا بھی ہوسکتا ہے، لیکن ننگے رہنے کو انسان وانسانیت کا عین مقصود قرار دینا، کیونکر درست ہوسکتا ہے۔

بیشک یونان میں کسی وقت مجسمے عریاں بنائے جاتے تھے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ مجسمے بنانے والے خود بھی عریاں رہتے تھے۔ عریاں مجسمے یا تصاویر بنانا ایک تفریحی آرٹ تھا اسی حیثیت سے اسے دیکھا جاتا تھا، نہ یہ کہ اس کو اصل مقصد قرار دیا گیا ہو

مقالہ نگار نے اخلاقی بلندی کا بھی ذکر اسی سلسلہ میں کیا ہے، لیکن شاید وہ دُنیا کے مصلحین میں سے کسی ایک کو بھی "فلسفۂ عریانی" کا پابند نہیں ثابت کرسکتے، یہاں تک کہ خود بودھ جن کی یادگار میں اکثر عریاں تصویریں نظر آتی ہیں، ننگے نہ رہتے تھے۔

اگر فلسفۂ عریانی سے مقصود یہ ہو کہ انسان کو کم سے کم لباس پر قناعت کرنا چاہئے، تو اس کے ماننے میں کسی کو عذر نہیں ہوسکتا لیکن اگر اس سے مراد بالکل جامۂ انسانیت اُتار دینا ہو تو اس کا جواز شاید کسی دلیل سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

اس فلسفہ کے پابند جنسی جذبات کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر لوگ ننگے پھرنے لگیں گے تو ان کا جذبۂ شہوانی بھی ضعیف ہوجائے گا اور مرد وزن میں ایک دوسرے کی طرف جنسی کشش اتنی کمزور ہوجائے گی کہ اخلاق پر اس کا اچھا اثر پڑے گا۔ وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں عریانی کی موافقت میں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ قاطع دلیل اس کے خلاف کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

اگر عریاں رہنے کے بعد جنسی کشش مضمحل یا مفقود ہوجاتی ہے، تو اس سے زیادہ بدنصیبی ایک انسان کے لئے اور کیا ہوسکتی ہے اور دنیا میں وہ کون ہے جو جلوت کی اس لذت کُش عریانی کو خلوت کی لذتِ عریانی پر قربان نہ کردے گا۔

عریاں رہنے کی تحریک پچھلی لڑائی کے بعد سب سے پہلے جرمنی میں شروع ہوئی اور شاید اس لئے کہ وہاں کے بعض افراد کی اقتصادی حالت اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ کپڑے زیادہ استعمال کرسکیں، لیکن چونکہ یوروپ کا انسان ہر بات کو علم وفلسفہ کے رنگ میں پیش کرنے کا عادی ہے، اس لئے انھوں نے بھی اسے اسی رنگ میں پیش کیا اور بہت سی بے سروپا دلیلیں اسکی موافقت میں پیش کردیں۔ لیکن چونکہ یہ تحریک اُصولاً بہت ناقص تھی اس لئے ترقی نہ کرسکی اور سوائے اس کے کہ ایک آرٹ کی حیثیت سے گفتگو کا موضوع قرار پائے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دیگئی تو آیندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاکخانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُسکے بعد قیمتاً یعنے ۸ر کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔ منیجر نگار

مکتوبات نیاز

بندہ نواز - مکرمت نامہ کا شکریہ - افسوس ہے کہ میں تعمیل ارشاد سے قاصر رہوں گا۔ کیونکہ وہاں جانے کے لئے جس تصنع و تکلف کی ضرورت ہے وہ مجھ سے بن نہ پڑے گا اور میرے ساتھ خواہ مخواہ آپ بھی بدنام ہو جائیں گے۔

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں ایک زمانہ سے گوشہ نشین ہوں اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر چکا ہوں۔ یہاں تک کہ اب مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ عوایدِ مجلسی کیا ہیں اور کسی سے ملئے تو سب سے پہلی بات کیا کہئے۔

معلوم نہیں اور لوگ کیا کرتے ہیں، لیکن زمانہ کی "اندوہگینی" کا اثر تو مجھ پر یہی ہوا ہے۔ اس لئے ایسی خدمت کے لئے جس میں سب سے پہلے چہرہ پر مصنوعی تبسم پیدا کرنے کی ضرورت ہو، بھلا میں کیا موزوں ہو سکتا ہوں۔

میں اپنی ذات سے "قنوطی" نہیں ہوں، لیکن اپنے سوا ساری دُنیا کو ایسا ہی سمجھتا ہوں اس لئے بسورنے والوں کے سامنے میں ہنسوں بھی تو اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ کہئے تو لکھ کر آپ کا پیام ان تک پہونچا دوں، لیکن شاید یہ اُس سے زیادہ نامعقول بات ہوگی

جی ہاں، مجھے آپ کی "سخاوت" و "کرامت" دونوں کا حال معلوم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آپ نے کیا ہے وہ تو جعفر برمکی اور جنید و شبلی کے بس میں نہ تھا، کسی اور کا کیا ذکر ہے۔

شکر ہے، میں اچھا ہوں، اور اتنے حواس مجھ میں باقی ہیں کہ سیاہ و سفید میں تمیز کر سکوں

مُرو ایں دام بر مرغِ دگر نہ

قبلہ - مجھ پر یہ الزام کہ میں دُنیا کا آدمی نہیں، بالکل درست ہے، لیکن اِس "طبعِ سہل انگار" کا کیا علاج

در ہر کہ بنگرد غلطِ یار می خورد چشم خطا نظارہ، ندانم چہ دیدہ است

جاہل بھی ہوں اور کاہل بھی۔ نہ حقیقت سے واقف نہ اُس کی جستجو - آپ کب تک ایسے بدنصیب پر آنسو بہائیں گے۔

عاقبت کا ذکر کر کے البتہ آپ نے دل میں دھڑکا سا پیدا کر دیا ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ "حشرات" کی طرح میری عاقبت اس دُنیا سے گزر کر کسی دوسری دُنیا تک نہ پہونچے، اور اگر ایسا ہو بھی تو کیا؟ آپ کو ڈھونڈھ نکالنے میں چاہے جتنی زحمت ہو لیکن ایکبار آپ کا دامن ہاتھ آگیا تو کیا آپ فردوس میں تنہا چلے جائیں گے؟ زندگی کے ابھی کچھ دن اور باقی ہیں، انھیں بھی بے خبری میں گزر جانے دیجئے، آپ کیوں ایسی بات اپنے منہ سے نکالیں، جس کے سننے کو کسی کا جی نہ چاہے - دیرے ست کہ خاطرم بجا نیست!

محترم - یقیناً میں بیدل کا شیدا ہوں اور اس لئے مجھے "بیگانۂ لذتِ تصوف" کہنا درست نہیں - لیکن وہ چیز تصوف میں ہے کہاں، جو آپ مجھ سے تسلیم کرانا چاہتے ہیں - وہاں تو خدا بھی اتنا ہے اور اتنا ساری کائنات پر محیط -

تصوف کی دُنیا، حشر و نشر، فردوس و جہنم سے بہت بلند واقع ہوئی ہے اور وہاں کفر و اسلام دونوں ہم آغوش نظر آتے ہیں کبھی آپ نے اُس کے اِس شعر پر بھی غور کیا ہے ؟

در ہائے فردوس وا بود امروز از بیدماغی گفتیم فردا

اس سے زیادہ صریح انکار حشر و نشر یا دوسرے عالم کا اور کیا ہو سکتا ہے - یعنی جس چیز کو فردوس بتاتے ہیں اس کے دروازے تو ہم پر آج ہی، اسی دُنیا میں کھُلے ہوئے تھے، لیکن یہ ہماری بد دماغی تھی کہ ہم نے اسے فردا پر ٹالدیا -

رہگیا طاعت و بندگی کا سوال، سو اس باب میں بیدل کا فیصلہ یہ ہے :

مشرب پروانہ از آتش نداند طور را

اصل مقصود تو محبت میں تڑپتے رہنا ہے اور محبت یہ نہیں دیکھتی کہ تڑپانے والا کون ہے -

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

اب آپ کیا فرماتے ہیں ؟ اگر کوئی اور "صاحبدل" آپ کی نگاہ میں ہو تو اس کا پتہ بتائیے، شاید حشر و نشر والا خدا، اپنے بندوں کو آگ میں جھونک کر خوش ہونے والا خدا وہیں مل جائے !

مکرمی - آپ زحمت نہ فرمائیے، میں خود فراہم کرلوں گا - میرا مدعا تو صرف اس قدر تھا کہ آپ کو بھی اس کا علم ہو جائے کہ مجھے ایسی چیز کے وجود کا علم ہے - آپ کے رفیق کار یہاں تشریف لائے تھے، مجھ سے ملے تو نہیں، لیکن مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ یہاں سے بامراد واپس گئے - کیا آپ کو اس کے خلاف کوئی اطلاع ملی ہے ؟

نوید کا شکریہ، لیکن "دعوتِ آب و ہوا" کئے اتنا زمانہ گزر گیا ہے کہ اب ہمت نہیں ہوتی - علاوہ اس کے یوں بھی بعض مصروفیتیں ایسی ہیں کہ دوسروں کا حق تلف کئے بغیر میں فی الحال لکھنؤ نہیں چھوڑ سکتا -

موسم خوشگوار ضرور ہے، لیکن شاید ضرورت سے زیادہ - اب تو ہر چیز نپی تُلی چاہئے - کانٹا ذرا بھی کسی طرف جُھکا اور خلش پیدا ہوئی -

---

معاذ اللہ یہ آپ نے کیا ذکر چھیڑ دیا !

یادِ کسے بخاطر ناشاد می رسد

آپ کو معلوم ہے کہ میں کبھی "محرومِ تماشا" نہیں رہا لیکن یہ بات اب سمجھ میں آئی ہے کہ فطرت شاید اس سے زیادہ ظلم کر بھی نہ سکتی تھی - منزل تک پہونچنے کا لطف اسی میں ہے کہ انسان ٹھوکریں کھا کھا کر وہاں تک پہونچے - لیکن اس کا علم اسوقت ہونا جب ٹھوکریں کھانے کی ہمت باقی نہ ہو، ظلم نہیں تو اور کیا ہے !

آپ کی میری عمر میں زیادہ تفاوت نہیں، لیکن احساس میں شاید ہے، اسی لئے آپ ماضی کے ذکر سے بھی لطف لیتے

ہیں اور یہاں ۔تنگ نظری کہئے یا مایوسی ۔ حال کے متعلق بھی احساس کی رسائی اس سے زیادہ نہیں کہ

جلوہ بسیارست اما یک تماشہ بیش نیست !

ایک وقت وہ تھا کہ تمنائیں مٹا دینا کھیل نظر آتا تھا یا اب یہ عالم ہے کہ ہر ہر آرزو پر مٹ جانے کو جی چاہتا ہے جذبات انسانی کے بہار و خزاں میں اتنا فرق ! معاذاللہ ! یا پھر اس کا سبب یہ ہوگا

مرا صبرے کم ست و درد بسیارست می نالم

امتحانِ صبر عاشق اینقدر ہا خوب نیست
اے بقربانت روم آخر دلم ایوب نیست

اور ایوب بھی ہوتا تو کیا ؟ ان کا چارۂ درد صبر سے کب ہوا تھا کہ مجھے اس سے کچھ فایدہ پہونچتا ۔ میں کہتا ہوں، یہ آپ کی دلداریاں کیوں اس قدر دل آزاریوں میں تبدیل ہوتی جاتی ہیں ۔ کتنا اچھا زمانہ تھا جب آپ کچھ نہ تھے ۔ سچ ہے "سرمایہ داری" سے زیادہ لعنت دُنیا میں کوئی نہیں ۔

شکایت یہ نہیں کہ آپ خطوں کا جواب نہیں دیتے، بلکہ رونا اس بات کا ہے کہ اب آپ غریبوں کو قابلِ التفات ہی نہیں سمجھتے ۔ حالانکہ یہی وقت "لطف و محبت" کی آزمایش کا ہوا کرتا ہے ۔

مجھے آپ کی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا علم ہے، لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ انھیں مشاغل میں آپ کے وہ قہقہے بھی شامل ہیں جن سے آپ کی "شبستان عیش" گونجا کرتی ہے ۔ کاش کے آپ مہینے میں کم ازکم ایک ہی شام آنسو بہانے کے لئے بھی وقف کر سکتے خیر، آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تو نہ آئے ۔

دردرا دستگاہ بسیارست

مکرمی ۔ آپ نے اس قدر صاف صاف باتیں کی ہیں کہ میں ان کا جواب دینے کی ہمت اپنے آپ میں نہیں پاتا ۔ میری تحریر غور سے پڑھئے آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ میں نے بعض مشہور شاعروں کو کیوں چھوڑ دیا اور بعض اچھا نہ کہنے والوں کو کیوں شامل کر لیا ۔

میں جانتا ہوں کہ آپ نے جن صاحب کا ذکر کیا ہے وہ بہت مشہور ہیں، لیکن نوجوان طبقہ سے میں نے صرف اُن کو لیا ہے جو واقعی اچھا کہتے ہیں اور "مشارالیہ" بہت غلط گو ہیں ۔ اس میں تعلق یا عدم تعلق کو مطلقاً دخل نہیں ہے ۔

میری رائے میں اس بات کو اسی جگہ ختم کر دینا چاہئے، ورنہ بات پبلک میں آگئی تو پھر مجھے بھی پبلک ہی کو بتانا پڑیگا کہ آپ کی خوش ذوقی و سخن سنجی کا معیار کس قدر غلط ہے !

قبلہ زحمت تو ہوگی، لیکن قربان حسین صاحب کو بلا کر کہدیجئے کہ اگر وہ میری بتائی ہوئی شرائط پر حیدرآباد جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں ۔ وہ اپنی بیوی کی علالت کی وجہ سے مجبور تھے ۔ لیکن اب غالباً وہ اچھی ہوں گی اور ان کے جانے میں کوئی

چیز مانع نہ ہوگی۔

اگر وہ راضی نہ ہوں، تو پھر آپ ہی کوشش فرمایئے کہ کوئی شخص انھیں کی سی "دستگاہ" رکھنے والا مل جائے۔ مجھ پر اُدھر سے سخت تقاضہ ہے اور میں اُس کا انتظام آپ سے لیتا رہوں گا، جب تک آپ نے کوئی آدمی فراہم نہ کیا۔ آپ چاہیں تو یہ بات زیادہ مشکل نہیں۔ جواب کا منتظر ہوں۔

حضرت المکرم ۔ یقیناً میں تعمیل ارشاد نہیں کر سکا اور اگر بات معافی سے ٹل جائے تو میں طلب عفو کے لئے ہزار بار طیار ہوں، لیکن پہلے اس کا یقین تو دلایئے کہ اس کے بعد آپ کا دل صاف ہو جائے گا۔ عرب نسل کے لوگوں سے ڈرتا ہوں کیونکہ شتر کینہ کی بہت سی ہولناک مثالیں میری نگاہ سے گزر چکی ہیں۔

توقع کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو یقیناً بہت رنج ہوتا ہے، لیکن پہلے اپنی زندگی کا جایزہ لیجئے اور دیکھئے کہ اسوقت تک آپ نے اپنی عہد شکنی سے کتنے دل توڑے ہیں۔ اگر آپ اس کی کوئی توجیہ ایسی کر سکتے ہیں کہ آپ کا ضمیر اس سے مطمئن ہو جائے تو پھر میں کیوں آپ کی برہمی سے ڈروں ؟

آپ سے کبھی ملاقات ہوگی تو زبانی عرض کروں گا۔ محبت کی شکایتیں کہیں خطوں سے دور ہوتی ہیں !

محترمہ ۔ یاد فرمائی کا شکریہ اور گلہ مندیوں پر سرِ نیاز خم ! حقیقت یہ ہے کہ آپ کے خلوص نے تاویل و معذرت کے بھی دروازے بند کر دئے ہیں، ورنہ میں آپ کو یقین دلاتا کہ میری خاموشی کا مقصود سوا اس کے کچھ نہ تھا کہ آپ کو کیوں زحمتِ تحریر میں مبتلا کروں۔ رہا سوال میرے قلب کے اطمینان کا، سو آپ جانتی ہی ہیں کہ "رجائی" انسان ہوں اور حشر کی ملاقات کا قایل ہوں یا نہ ہوں لیکن

زبوئے گل توانی واکشید آوازِ بلبل را

کا ضرور قایل ہوں۔

آپ نہیں جانتیں کہ "تصور" کے برکات کیا کیا ہیں اور اس نے کتنے گرتے ہوئے گھر سنبھال لئے ہیں۔ لیکن اگر آپ اس "خاموش پرستش" کو پسند نہیں فرماتیں، تو مجھے بھی گھُل گھُل کر جان دینا زیادہ پسند نہیں۔ لیجئے

نظارہ کن زچاک کتاں ماہتاب را !

ایک اڈیٹر کی دلچسپ غلطی

کسی اخبار کے اڈیٹر نے شہر کے ایک بہت معزز آدمی کے انتقال کی خبر شایع کی، حالانکہ وہ صاحب زندہ تھے۔ دوسرے دن وہ آئے اور اڈیٹر سے کہا کہ "مجھے اس جھوٹی خبر کے شایع ہونے کا اتنا رنج نہیں جتنا ان الفاظ کا جو آپ نے استعمال کئے ہیں"۔ وہ الفاظ یہ تھے: "ہم مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کا انتقال ہو گیا"۔ اڈیٹر نے معذرت کی اور کہا کہ کل کے اخبار میں اسکی تلافی کر دی جائے گی۔ لیکن تلافی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔ "ہمیں افسوس ہے کہ فلاں صاحب کے انتقال کی خبر غلط تھی"۔

نازی سپاہی کیونکر طیار کیا جاتا ہے؟

۱۹۱۴ء سے اسوقت تک جرمن فوج میں جتنی ترقی ہوئی ہے اس کا صحیح اندازہ تو مشکل ہے، لیکن جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ بھی کم حیرت انگیز نہیں۔ پچھلی لڑائی میں اسکی تمام عسکری قوت جو میدان جنگ میں کام کر رہی تھی، ۱۷ لاکھ ۵۰ ہزار سے زیادہ نہ تھی، لیکن موجودہ لڑائی سے پہلے امن کی حالت میں اس کی تعداد ۹ لاکھ ۵۰ ہزار تھی درانحالیکہ فرانس موجودہ لڑائی میں، ۱۷ لاکھ ۳۵ ہزار سے زیادہ فوج فراہم نہ کر سکا، اس کے معنے یہ ہیں کہ جرمنی کی فوجی طاقت امن کی حالت میں بھی، فرانس کے زمانۂ جنگ کی فوجی طاقت سے بقدر دو لاکھ ۱۵ ہزار زیادہ تھی۔

جسوقت سے نازی حکومت کا دور دورہ شروع ہوا ہے، اس کی ساری توجہ فوج کو بڑھانے اور مضبوط کرنے پر صرف ہو رہی ہے، چنانچہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ جرمنی اِس وقت ۶۰ لاکھ فوج میدان میں اُتار سکتا ہے۔

جرمن عسکریت کا سب سے زیادہ مضبوط حصہ اس کی پیادہ فوج ہے۔ ہر چند اسکی تعداد دو تہائی سے زیادہ نہیں اور اب ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہے، پھر بھی پیادہ فوج کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اسکی تربیت پر خاص زور دیا جاتا ہے۔

جرمنی کی پیادہ رجمنٹ علاوہ تمام ضروری ہتھیاروں کے جن میں رائفل اور مشین گن بھی شامل ہے، دستی بم پھینکنے والے دستے بھی رکھتی ہے، ہلکی ہلکی دور مار توپیں بھی اس کے پاس ہوتی ہیں اور ٹینک شکن بندوقیں بھی۔ پیادہ رجمنٹ کا صرف ایک حصہ آہن پوش موٹروں سے کام لیتا ہے۔ اور باقی فوج سب گھوڑوں ہی سے کام لیتی ہے۔ اسی لئے جرمن افواج میں آدھے سے زیادہ گھوڑے پیادہ رجمنٹوں میں پائے جاتے ہیں۔

ایک پیادہ سپاہی کی تربیت صرف اس بات پر ختم نہیں کہ وہ خود اپنے ہی ہتھیاروں کا بہترین استعمال کر سکے، بلکہ توپ خانوں اور شعبۂ انجینیری کے متعلق جتنے آلات اور اوزار ہوتے ہیں، ان سب کا استعمال بھی اسے بتایا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ وہ دشمن پر دفعتاً حملہ کرنا، مورچے چھین لینا اور دست بدست لڑائی لڑنا سیکھے۔

اس کو کمر اور کولے پر بندوق رکھ کر نشانہ لگانا سکھایا جاتا ہے، کیونکہ بندوق کو کندھے تک لیجانے میں وقت زیادہ ضایع ہوتا ہے۔ انھیں دستی بم پھینکنا اور ان بموں سے بچنا بھی بتایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ تعلیم بھی دیجاتی ہے کہ اگر ہتھیار موجود نہ ہوں تو وہ صرف مکّوں اور داؤ پیچ سے کیونکر دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات جس میں ان کا کوئی مماثل نہیں، ان کا دھاوا ہے۔ جرمن پیادہ فوج ۲۴ گھنٹے میں ۴۵ میل کا دھاوا بول سکتی ہے اس حال میں کہ ہر سپاہی کی پیٹھ پر اس کے اسلحہ و دیگر ضروری سامان کا کافی بوجھ موجود ہوتا ہے۔

پیادہ فوج کی مدد کے لئے وہاں توپ خانہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے اور بہ نسبت پچھلی جنگ کے اسوقت وہ تعداد و آراستگی میں کہیں

زیادہ مکمل ہے۔ توپ خانہ میں ہلکی ہلکی توپیں ہوتی ہیں جن کی مار دور تک نہیں ہوتی لیکن کام زیادہ دیتی ہیں۔ ان کا لوہا نہایت اچھے قسم کا ہوتا ہے اور صحیح نشانہ لگانے کے آلات و ذرایع بھی ان میں پائے جاتے ہیں۔ انجینیری اور پیام رسانی کے شعبے بھی جدید آلات سے آراستہ ہیں اور بہ نسبت پچھلی لڑائی کے ان کی حالت کہیں بہتر ہے۔

سوار فوج میں موٹر سوار اور بائسکل سوار بھی شامل ہیں۔ مسلح گاڑیاں بھی ہر ڈویژن کے ساتھ رہتی ہیں جو زیادہ تر ہراول کا کام دیتی ہیں۔ ٹینک کا استعمال وہاں پیادہ فوج کی معیت میں بہت کم ہوتا ہے بلکہ جب یلغار کرکے دشمن کو منتشر کرنا مقصود ہوتا ہے تو انکو حرکت دیجاتی ہے۔ ٹینکوں کی وہاں متعدد ڈویژنیں ہیں جن سے ہراول، حملہ اور تعاقب کا کام لیا جاتا ہے۔

جرمن عسکریت کا نظام زیادہ تر جارحانہ اقدام پر مبنی ہے اور اچانک فوری حملوں پر۔ اسی حرکت و عمل کی تیزی سے انھوں نے پولینڈ میں کامیابی حاصل کی اور اسی سے فرانس میں کام لیا۔ لیکن اگر دشمن چند دن مقابلہ میں ڈٹ جائے تو پھر جرمن فوج اتنا اچھا کام نہیں کرسکتی۔

خشکی پر جرمن فوج کی مضبوطی کا وہی حال ہے جو سمندر میں برطانوی فوج کا ہے، افسران فوج جرمنی کے پاس اتنے آزمودہ کار نہیں ہیں جتنے برطانیہ کے پاس۔

جرمن افواج میں زیادہ تر وہ نوجوان شامل ہیں جو ہٹلر کو اپنا دیوتا سمجھتے ہیں اور نازیت کو خدائی مذہب سمجھتے ہیں، لیکن محفوظ فوج جس میں پختہ عمر کے لوگ شامل ہیں، اس عقیدہ کے نہیں ہیں۔

جرمن نوجوانوں کو فوجی زندگی کی طرف مایل رکھنے کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچائی جاتی ہیں، ان کا کھانا، ان کا لباس اور انکے بارکیں سب نہایت نفیس ہوتی ہیں اور طرح طرح سے پروپاگنڈا کرکے ان کو نازی اصول کا فریفتہ بنایا جاتا ہے۔

جرمنی کا نظام حکومت ہی یکسر عسکریت ہے جس پر تہذیب و تمدن کے تمام شعبوں کی قربانی کی جاسکتی ہے اور جو یہ خیال لیکر نمودار ہوئی ہے کہ دنیا میں حکمرانی کا حق صرف جرمن قوم کو حاصل ہے اور باقی ساری دنیا اس کی غلامی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس سے پہلے بھی بعض قومیں اسی خیال کو لیکر ابھریں، لیکن انسانیت ان کے اس نظریہ کا ساتھ عرصہ تک نہ دے سکی اور اس کا ردِ عمل ہمیشہ ان کے خلاف ظاہر ہوا۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ جرمن قوم کو عارضی کامیابی حاصل ہوجائے لیکن اسکا انجام بہت تاریک نظر آتا ہے، کیونکہ وہ قومیں جو اسوقت مجبوری سے جرمن سیادت کو تسلیم کئے ہوئے ہیں، ایک نہ ایک دن ضرور ان زنجیروں کو توڑ دیں گی اور نازیت ہمیشہ کے لئے دنیا سے ختم ہوجائے گی۔ کیونکہ آزادی انسان کا فطری حق ہے اور اس حق سے ایک انسان کو عرصہ تک محروم رکھا نہیں جاسکتا!

"نگار" کے پچھلے پرچے

۱۹۲۶ء: جنوری ۸ر - ۱۹۲۷ء: اگست عدد - ۱۹۲۸ء: مئی عدد - جون عدد - ۱۹۳۰ء: مئی ۱۲ر - ۱۹۳۱ء: جولائی تا دسمبر ۸ر فی پرچہ —
۱۹۳۲ء: جنوری ۱۲ر، فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، ستمبر، نومبر ۸ر فی پرچہ، دسمبر عدد - ۱۹۳۳ء: فروری ۸ر - ۱۹۳۴ء: فروری، مارچ مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عدد فی پرچہ - ۱۹۳۶ء: دسمبر ۱۲ر - ۱۹۳۷ء: فروری، مارچ ۱۲ر فی پرچہ - اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ر فی پرچہ - ستمبر، اکتوبر، دسمبر ۱۲ر فی پرچہ - ۱۹۳۸ء: فروری، اپریل تا دسمبر ۴ر فی پرچہ - ۱۹۳۹ء: فروری تا جولائی ۴ر فی پرچہ - اکتوبر و نومبر ۸ر فی پرچہ -

منیجر نگار لکھنؤ

بیسویں صدی کا سب سے بڑا ساحر و شعبدہ باز

(ہوڈنی)

اب سے بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے کہ ساری دُنیا میں ہوڈنی کی سحر و ساحری کا غلغلہ بلند تھا اور عالم حیران تھا کہ وہ باتیں جو انسانی قوت سے بالکل باہر ہیں، کیونکر اس سے ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ اپنے فن کا اتنا بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا کہ انگریزی زبان میں "Houdinian" (ہوڈنزم) کا لفظ ہی وضع ہوگیا، جس کے معنے محیر العقول کارنامے دکھانا ہے۔

یہ امریکہ کے ایک یہودی خاندان میں ۶ اپریل ۱۸۷۴ء کو پیدا ہوا اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ۵۲ سال کی عمر میں مرگیا۔ اس باون سال کے زمانہ میں ۴۲ سال اس کے اسی مشغلہ میں گزرے، یعنی نو سال کی عمر سے اس نے اس فن کو اختیار کیا اور اخیر دم تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ یہ تمام باتیں اس سے کیسے ظاہر ہوتی ہیں۔

اس کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے، جس کو ہم آیندہ صفحات میں اجمالاً بیان کریں گے۔ جس وقت اس کی عمر ۶ سال کی تھی اسی وقت سے اُسے شعبدہ بازی کا شوق تھا، اس کا بدن بہت لچیلا تھا، اور سات ہی سال کی عمر میں وہ ایسی ایسی ورزشیں دکھاتا تھا کہ لوگ حیرت کرتے تھے۔ چونکہ وہ ایک غریب خاندان کا لڑکا تھا اس لئے وہ کبھی اخبار بیچکر اور کبھی جوتوں پر پالش کرکے زندگی بسر کرتا۔

اس کی عمر نو سال کی تھی کہ اس کے قصبہ میں سرکس آیا اور اسی وقت سے اس کی زندگی کا مستقبل متعین ہونے لگا۔ یہ سرکس کے منیجر کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے بھی کچھ شعبدے دکھانے کی اجازت دیجائے۔ منیجر نے اجازت دیدی۔ اس موقعہ پرستی سے اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر گرہ لگادیگئی، لیکن اس نے اپنے آپ کو چھڑالیا، دوسری بات یہ دکھائی کہ فرش پر پڑی ہوئی آلپینوں کو اس نے اپنے آنکھ کے پپوٹوں سے اُٹھالیا۔ ان کے علاوہ اس نے اور بھی کرتب دکھائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرکس میں ملازم ہوگیا، لیکن اس کے باپ نے سرکس کے ساتھ باہر جانے کی اجازت نہیں دی۔

گیارہ سال کی عمر میں وہ ایک قفل ساز کی دوکان پر ملازم ہوگیا۔ یہاں اس نے اتنی زبردست مہارت قفل کھولنے میں پیدا کرلی کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مشینری کا قفل وہ آسانی سے کھول لیتا۔ اسی کے ساتھ وہ جمناسٹک کی مشق بھی کرتا رہا اور شعبدہ بازی کی بھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں اسے ایک مشہور فرانسیسی شعبدہ باز رابرٹ ہوڈن کی کتاب ہاتھ آگئی جس میں بہت سے شعبدوں کے راز درج تھے۔ اس کے مطالعہ کے بعد اس نے اپنا نام رہرج ویز بدل کر ہوڈنی رکھ لیا اور اپنے ایک دوست کو شریک کرکے پیشہ کی حیثیت سے شعبدہ بازی اختیار کرلی۔ لیکن اس دوست سے بنی نہیں اور چند دن بعد اس سے قطع تعلق کرکے اپنے بھائی کو اپنا شریک بنالیا۔

انیس سال کی عمر میں اس نے شادی کی اور اپنی بیوی کو بھی شعبدہ بازی اور قرأت افکار (Thought reading) کے

اُصول بتائے۔ بعد کو اس کی بیوی نے وسیط یا معمول (Medium) کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کی۔

چونکہ اب ہوڈنی نے مستقلاً یہی پیشہ اختیار کر لیا تھا، اس لئے وہ یوروپ و امریکہ کے مختلف مقامات میں اپنے کرتب دکھانے لگا لیکن جو شہرت اس کو حاصل ہونا چاہئے تھی وہ ابھی تک حاصل نہ ہوئی تھی۔ لیکن جب چکاگو کے قید خانہ میں وہ ہتھکڑی ڈالکر بند کیا گیا اور اُس سے باہر نکل آیا تو اس کی شہرت بہت پھیل گئی۔ اس کے بعد اس نے لندن اور برلن میں بھی وہاں کی پولیس کو چیلنج دیا اور کسی قسم کی کوئی ہتھکڑی ایسی نہ نکلی جس سے اُس نے اپنے آپ کو آزاد نہ کر لیا ہو۔

وہ بنکوں کے تجوریوں میں بند کیا گیا اور اُن سے باہر نکل آیا، وہ صندوقوں میں بند کر کے پانی کے اندر ڈالدیا گیا اور صحیح وسلامت اوپر آگیا، وہ زمین کے اندر دفن کیا گیا اور زندہ نکل آیا، اس نے لوگوں کے خیالات پڑھے، دل کی باتیں بتائیں، اور خدا جانے کیا کیا شعبدے دکھائے اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ یہ سب کیونکر انجام دیتا تھا۔ ہوڈنی بے انتہا ذہین اور صحیح ہوش و حواس کا آدمی تھا اور اسکی کامیابی میں ذہنی و جسمانی دونوں قسم کی ورزش کو دخل تھا۔

اب ہم مسٹر کینیلی کی روایت سے اس کے مختلف کرتبوں کا حال بیان کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ وہ کن ترکیبوں سے کامیابی حاصل کرتا تھا۔

(۱) جب وہ لندن پہونچا تو اس نے وہاں کے بنکوں کو چیلنج دیا کہ وہ ہر قسم کی تجوری سے باہر آسکتا ہے۔ یہاں ایک نہایت مشہور تجوری بنانے والا کارخانہ تھا، اس نے چیلنج قبول کر لیا اور ہوڈنی سے پوچھا کہ اس کی شرائط کیا ہیں، اس نے صرف ایک شرط پیش کی اور وہ یہ کہ تجوری ایک دن قبل اس کے پاس بھیجدی جائے، چونکہ کارخانہ کو اپنی تجوری کی مضبوطی اور اس کی مشینری پر پورا یقین تھا اس لئے اسنے کہا کہ ہم ایک دن کیا ایک ہفتہ پہلے بھیجنے کے لئے طیار ہیں۔

یہ تجوری اتنی بھاری تھی کہ اس کا منتقل کرنا آسان نہ تھا، لیکن بہت سے آدمیوں کی مدد سے وہ اُٹھائی گئی اور اسٹیج پر لاکر رکھی گئی۔

جس رات یہ تماشہ ہونے والا تھا تھیٹر میں ہجوم کا یہ عالم تھا کہ بہت سے آدمیوں کو جگہ نہ ملی اور واپس لوٹ گئے۔

جب پردہ اُٹھا تو پبلک نے دیکھا کہ عظیم الشان تجوری جس کے اندر ایک آدمی بہ آسانی کھڑا ہو سکتا ہے سامنے رکھی ہوئی ہے اور ہوڈنی صرف ایک ڈرسنگ گون پہنے ہوئے اسی کے پاس کھڑا ہے۔ اس نے آگے بڑھکر کہا کہ میں ایک نہایت خطرناک جرأت پر آمادہ ہوا ہوں کیونکہ تجوری کے اندر کوئی شخص دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن چونکہ میں چیلنج دیچکا ہوں اس لئے کامیابی کی پوری کوشش کروں گا اس کے بعد اس نے تماشائیوں میں سے چند آدمیوں کو بُلایا کہ پہلے تجوری کو دیکھ لیں۔ ان میں ایک مقامی ڈاکٹر بھی تھا اور تجوری کے کارخانہ کا ایجنٹ بھی تھا۔ اس تجوری کی صرف ایک ہی کنجی تھی اور وہ اسی ایجنٹ کے پاس تھی۔

جب اس کمیٹی نے دیکھ لیا کہ تجوری اپنی اصلی حالت پر ہے تو ہوڈنی نے ڈرسنگ گون اُتارا اور درخواست کی کہ اس کے جسم کی تلاشی لے لیجائے اور ڈاکٹری حیثیت سے بھی اس کا معائنہ کر لیا جائے، چنانچہ مقامی ڈاکٹر جو تجوری دیکھنے آیا تھا طیار ہوگیا۔ ہوڈنی نے کہا کہ ڈاکٹری معائنہ غالباً تجوری کے اندر زیادہ مناسب ہوگا لوگوں نے اس کو مان لیا۔ اس کے بعد ہوڈنی نے یہ تجویز پیش کی کہ کمیٹی کا ایک آدمی تجوری کا اندرونی حصہ دیکھ لے تاکہ جب بعد کو تجوری کا معائنہ اندر سے کیا جائے تو وہ امپائر کی حیثیت سے فیصلہ کر سکے۔ تماشائیوں نے اس درخواست کو بھی مان لیا۔

جب ڈاکٹری معاینہ ہو چکا تو کمیٹی کے آدمی اور ڈاکٹر تجوری سے باہر آئے اور ڈاکٹر نے اعلان کیا کہ تجوری بالکل اپنی اصلی حالت

پڑے اور ہوڈنی کی تلاشی سے کوئی چیز اس کے پاس نہیں نکلی۔ کمیٹی کے ممبروں نے بھی اس کی تصدیق کی اور ہوڈنی نے یکے بعد دیگرے ممبران کمیٹی سے ہاتھ ملایا اور تجوری کا دروازہ مقفل کر دیا گیا پھر تجوری کے چاروں طرف ایک پردہ اس طرح تان دیا گیا کہ اگر کوئی شخص باہر سے تجوری کے قریب آئے تو سب دیکھ سکیں۔

پندرہ منٹ اسی حال میں گزر گئے، لیکن ہوڈنی باہر نہ آیا۔ جب آدھ گھنٹہ گزر گیا تو لوگوں میں بےچینی پیدا ہونے لگی اور بعض نے کہا بھی کہ تجوری کھول دی جائے۔ ہوڈنی نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کر دی تھی کہ جب تک اندر سے کئی بار کھٹ کھٹانے کی آواز نہ آئے تجوری نہ کھلوائی جائے۔ لیکن جب ۴۰ منٹ گزر گئے اور آواز نہ آئی تو بعض عورتوں نے گھبرا کر تھیٹر والوں سے کہا کہ تجوری فوراً کھول دی جائے۔ لیکن پانچ منٹ اور گزرے تھے کہ ہوڈنی باہر آگیا اس حال میں کہ تجوری بند تھی۔ کمیٹی نے پھر تجوری اور قفل کا معائنہ کیا اور اس کو بدستور محفوظ پایا۔ اس واقعہ نے سارے لندن کو حیران کر دیا۔ اخباروں میں مضامین نکلے، ہوڈنی کی تصویریں شایع کی گئیں اور گھر گھر اس کا چرچا ہونے لگا۔

ہوڈنی تجوری سے کیونکر باہر نکل سکا، یہ راز اس کی زندگی بھر نہ کھل سکا۔ لیکن ہم آپ کو بتائیں گے کہ اصل راز کیا تھا۔

سب سے پہلے آپ اس پر غور کیجئے کہ ہوڈنی نے ایک دن پہلے تجوری کو کیوں طلب کیا تھا۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ اس کے قفل کو دیکھ کر اس کی ساخت میں کوئی تبدیلی ایسی کر دے جو بعد کو کھولنے میں مدد دے، چنانچہ اس نے قفل کی نئی سخت کمانیاں نکال کر دوسری نرم کمانیاں لگا دیں اور ایک کنجی بھی ایسی بنالی جس کی مدد سے وہ قفل کو کھول سکتا۔ لیکن چونکہ یہ تبدیلی ایسی نہ تھی جو باہر سے نظر آتی اسلئے کمیٹی کے ممبر تجوری کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کنجی اس کے پاس کیسے رہ سکتی تھی جبکہ اس کی تلاشی لے لی گئی تھی۔ اس کا راز یہ ہے کہ جب اس کی تلاشی لی گئی تو یقیناً کنجی اس کے پاس نہ تھی، لیکن جب اس نے تجوری کے اندر بند ہوتے وقت لوگوں سے ہاتھ ملایا تھا تو امپائر نے جو اس کا دوست و شریک کار تھا، کنجی اس کو دیدی۔ یہ کنجی امپائر کی انگوٹھی میں ایک کمانی کے ذریعہ سے چھپی ہوئی تھی جسے ہاتھ ملاتے وقت ہوڈنی نے لے لیا۔ ذیل کے نقشے سے آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ یہ کنجی کیسی تھی اور وہ انگوٹھی میں کس طرح چھپائی گئی تھی۔

ہاتھ کا نقشہ جس کی ایک انگلی میں انگوٹھی ہے اور اس میں تجوری کھولنے کی کنجی چھپائی ہوئی ہے

انگوٹھی اور تجوری کھولنے کی کنجی

ہوڈنی تجوری کے اندر داخل ہوتے ہی فوراً قفل کھولکر باہر آگیا تھا، لیکن محض لوگوں میں بےچینی پیدا کرنے کے لئے وہ پردہ کے اندر بیٹھا رہا۔ اس واقعہ کے بعد جب تجوری واپس کی گئی تو ہوڈنی نے پھر قفل کی اصلی کمانیاں لگادیں اور اس طرح تجوری کے کارخانہ والوں کو بھی نہ معلوم ہوسکا کہ کمانیاں بدلی گئی تھیں۔

(۲) ہوڈنی ایکبار یوروپ کے کسی بڑے شہر میں گیا اور اعلان کیا کہ وہ لوہے کے مقفل بائیلر (Boiler) سے باہر آجائے گا اس اعلان پر متعدد بائیلر بنانے والے کارخانوں نے اس چیلنج کو قبول کرلیا، کیونکہ اس طرح ان کا اشتہار بھی کافی ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک کارخانہ کا انتخاب ہوڈنی نے کیا اور اسے ایک خاص ساخت کا بائیلر بنانے کی ہدایت کی۔ اس بائیلر کا ڈھکنا اس قسم کا طیار کرایا گیا کہ وہ اصل ظرف کے اندر آجائے اور پھر ان دونوں میں سوراخ کئے گئے تاکہ لوہے کی دو سلاخیں اندر ڈال کر بائیلر اور اس کے ڈھکنے کو ایک دوسرے سے ملا دیا جائے اور وہ علٰحدہ نہ ہوسکیں۔ بائیلر کی شکل یہ تھی:

نقشہ
بائیلر کا
جس سے ہوڈنی باہر نکل آیا

جب یہ بائیلر طیار ہوگیا تو اسٹیج پر لایا گیا اور تمام تماشائیوں نے اس کو دیکھ کر اطمینان ظاہر کیا، کیونکہ اس کے اندر بند ہوجانے کے بعد باہر نکلنے کی کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔ ہوڈنی اس قسم کے کام ہمیشہ ایک ایسے کمرہ کے اندر دکھایا کرتا تھا جو لکڑی کے چوکھٹوں سے طیار کیا گیا تھا اور ہر جگہ لیجایا سکتا تھا، کمرہ کے باہر اس کے رفیق حفاظت کے لئے موجود رہتے تھے

جب اس بائیلر کی جانچ ہوچکی تو ہوڈنی اس کے اندر داخل ہوا اور بائیلر بنانے والے نے اوپر سے ڈھکنا بند کرکے دو سلاخیں آر پار کرکے باہر سے قفل ڈالدیا۔ اس کے بعد آرکسٹرا کا باجہ زور زور سے بجنے لگا اور تھوڑی دیر میں ہوڈنی باہر آگیا۔ لوگوں نے جاکر دیکھا تو بائیلر بدستور بند تھا اور باہر کی سلاخوں پر بھی قفل لگا ہوا تھا۔

ہوڈنی کیونکر باہر آیا۔ آپ بھی اس پر غور کیجئے اور سمجھ میں نہ آئے تو آیندہ ماہ کا نگار ملاحظہ فرمایئے جس میں اس کے اور بھی بہت سے شعبدے درج ہوں گے۔

ہوسٹل کے ایک گوشہ میں بیٹھکر

سوشلسٹ:

سوشلزم اچھی چیز ہے یا بری، یہ بحث بہت احتیاط چاہتی ہے۔ لیکن سوشلسٹ مفید ہے یا غیر مفید یہ شاید زیادہ سوچنے کی بات نہیں۔ کیونکہ اشتراکیت ابھی دور ہو یا نزدیک لیکن اشتراکیوں سے ہمیں روز واسطہ پڑتا ہے۔

کامریڈ کہلائے جانے کے بعد ایک شخص میں کچھ عجیب و غریب خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ تو کیسے کہدوں کہ اسے دلق و زنار سے کوئی تعلق ہو گا لیکن وہ کچھ اس طرح اپنے آپ کو ایک برتر جماعت کا فرد سمجھنے لگتا ہے کہ اسے دیکھ کر ہمیں اپنے یہاں کے مولوی اور مجتہد یاد آجاتے ہیں۔ پارٹی رجسٹر میں مندرج ہو جانے کے بعد سوشلسٹ یہ سمجھتا ہے کہ ہر شخص پر جو اپنے کو اشتراکی نہ کہتا ہو اسے ایک فوقیت حاصل ہو گئی ہے اور وہ ان منتخب لوگوں کی صحبت میں پہونچ گیا ہے جو ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہیں (غالباً اس نظر سے کہ ان کی برائیاں حسن اخلاق میں شمار کی جانے لگی ہیں اور ان کی خوبیوں کو جیسا کا تیسا چھوڑ دیا گیا ہے) ایک سوشلسٹ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ سر کے بال بڑے اور الجھے ہوئے رکھتا ہے ایک چادر گلے میں لپیٹے رہتا ہے وہ ہمیشہ چیخ کر بات کرتا ہے۔ (دوسری کی نہیں اپنی) دریدہ دہنی سے خوش ہوتا ہے غلط زبان بولتا ہے۔ بحث کے دوران میں دلیل کی بجائے اعضاء کی پُرشورش حرکات سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، تہذیب و سنجیدگی کو سرمایہ داروں کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ بڑی کار پر سوار ہوتا ہے۔ قالین پر بیٹھتا ہے۔ بکثرت سینما دیکھتا ہے اور دبلا ہوتا ہے اور یہ تمام باتیں مل جل کر کچھ ایسا منظر پیش کر دیتی ہیں کہ آپ پہلی ہی نظر میں بتا سکتے ہیں کہ یہ شخص اشتراکی ہے۔

میں اکثر غور کرتا ہوں کہ ہندوستانی سوشلسٹ اتنے متلون، آتش مزاج اور مجہول العمل کیوں ہوتے ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ گلے کی تمام رگوں کو پھلا کر انگریزی سامراج اور ہندوستانی سرمایہ داروں کو گالیاں دیتے رہیں۔

میں نے اپنے چند اشتراکی دوستوں سے دریافت کیا کہ اس قدر ہنگامہ آرائی کا سبب کیا ہے تو انھوں نے بیچینی سے بتایا کہ ہم دراصل ملک میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی حالت اس قدر ابتر ہو چکی ہے کہ جب تک پوری عمارت گرا کر از سر نو قائم نہ کی جائے کوئی صورت بہتری کی پیدا نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ اگر مکان کے تمام باشندوں کو زیر دیوار کھڑا کر کے مکان منہدم کر دیا جائے خواہ اسی نیت سے کیوں نہ ہو کہ دوبارہ اس سے بہتر طریقہ پر تعمیر کیا جائے گا تو ان بدقسمت مکان والوں کو اس سے کیا فائدہ پہونچے گا۔

اپنی عظمت کے بعد اشتراکی کو جو چیز یاد آتی ہے وہ روس کی بزرگی ہے خدا معلوم روس کو کیا خصوصیت اس نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھی ہے۔ وزرائے صوبہ متحدہ میں ایک کے پرائیویٹ سکریٹری نے ابھی حال ہی میں یورپ کی سیاحت سے واپس آکر ہمیں اپنے مشاہدات ایک غیر رسمی صحبت میں بیان فرمائے۔ ان کی گفتگو سے جو نتیجہ اخذ ہوتا تھا وہ یہ ہے کہ روس میں دو سو روبل کا ملازم بھی ہوتا ہے اور دو ہزار کا بھی۔ ریلوے ٹرین میں پہلا درجہ بھی رہتا ہے اور تیسرا بھی۔ تنہا فرق جو وہاں پایا جاتا ہے یہ ہے کہ دوسروں کی طرح دو ہزار

پانے والا بھی اپنی کل آمدنی خرچ کر دینے پر مجبور ہے، وہ اسے دفن کرکے نہیں رکھ سکتا اور نہ ذاتی کاروبار میں لگا سکتا ہے۔ اس طرح جو پیسہ ملک میں ہے وہ دورہ کرتا رہتا ہے۔ مزید براں روبل روس کے باہر نہیں لایا جا سکتا اور نہ باہر اس کی کوئی قیمت ہے۔ گویا روس میں ہر چند یہ تو نہیں ہے کہ سب کی آمدنی برابر ہو لیکن آمدنی کی بنا پر کسی شخص کو تفوق حاصل نہیں ہو سکتا۔ دراصل یہ معاشری جمہوریت ہے جو روس اور دوسری عوام کی حکومتوں کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔ سیاسی جمہوریت کم و بیش ہر ملک میں پائی جاتی ہے لیکن ذہنی جمہوریت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ امیر ہونے سے تو برائی لازم نہیں آتی البتہ امیر سمجھے اور امیر سمجھے جانے سے بہت سے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک عالم جاہل سے، مالدار بے زر سے منصب دار عوام سے اور اشتراکی غیر اشتراکیوں سے افضل سمجھے جاتے رہیں گے کوئی صحیح جمہوریت قایم نہیں ہو سکتی۔ تعصب جب تک ذہن سے محو نہ ہو جائے اور دماغ یہ سمجھنے کی حد تک آزاد نہ ہو جائے کہ کوئی شخص خواہ کچھ کر رہا ہو اگر کوئی تعمیری کام کر رہا ہے تو اتنا ہی اچھا ہے جتنا کوئی دوسرا، ملک کو ترقی یافتہ یا آزاد (یا اگر کوئی اسی طرح خوش ہوتا ہے تو) سوشلسٹ نہیں کہا جا سکتا۔ ورنہ یوں کامریڈ... لینن .... مزدور .... ہڑتال اور بھوک سے کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔

اس بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ روس غالباً وہ نہیں جو ہم سمجھتے ہیں اور اگر کوئی کہے کہ نہیں وہ اسے ایسا ہی سمجھتا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا ——— میرے ایک پروفیسر کا یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے کہ اکثر ذمہ دار سوشلسٹ بھی یہ نہیں جانتے کہ سوشلزم کیا ہے، وہ کیا کر رہے ہیں اور روس میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کی علمی واقفیت انگریزی اخبارات اور پنجابی ناشروں کے پمفلٹ تک منحصر ہوتی ہے۔ رہا عملاً سو ظاہر ہے کہ کوئی اطلاع حاصل کرنا نہایت دشوار ہے لیکن معلومات کسی طرح بھی ان کے کاروبار کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ کام کرنے کا یہ حال ہے کہ خاصے سربرآوردہ لوگ بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ انگلو طلبہ اور جاہلوں کے سامنے سوشلزم کی تبلیغ کرنا اور آرام سے رہنا چاہئے۔ اس سے زیادہ کسی بات کی ضرورت اس وقت تک نہیں جب تک انقلاب نہ ہو اور انگریز ہندوستان کو آزادی دیکر چلے نہ جائیں۔ یہ سوچنا ان کے مفاد کے موافق نہیں کہ انگریزوں کی موجودگی میں بھی کوئی مفید اشتراکی کام ہو سکتا ہے۔ اور اس کام کی نوعیت ذہنی اور بڑی حد تک اقتصادی ہو سکتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایک طرف تو لیڈر یہ سوچ رہا ہے کہ جب تک برطانیہ کا سایہ موجود ہے اس کی دال چل رہی ہے اور دوسری طرف والنٹیر اس حماقت میں مبتلا ہے کہ آزادی ملتے ہی لیڈر اپنی دال انھیں دیدیگا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے برطانیہ کا سایہ بھی باقی رہیگا اور دال بھی بدستور لیڈروں کے پاس رہے گی۔

چونکہ گفتگو خطرناک طوالت اختیار کرتی جا رہی ہے لہذا میں اختصار کے ساتھ اس بات کو دوبارہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہاں سوشلزم سے بحث نہیں ہو رہی ہے اور نہ کسی ایسی بحث کی چنداں ضرورت ہے۔ اصولی حیثیت سے یہ بات اب دلیل و حجت کی حد سے گزر گئی ہے اور ایک دن ایسا آتا ہے کہ اشتراکیت کسی نہ کسی صورت سے دنیا پر چھا جائے گی۔ قطع نظر اس سے کہ جمہوریت کی ناکامیابی اس بات کی مقتضی ہے کہ اشتراکیت کو بھی آزمایش کا موقع دیا جائے، دنیا کی تمام تاریخ اسی طرف اشارہ کر رہی ہے اور انسان کا ذہنی و معاشرتی ارتقا، صرف اسی ایک نتیجہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ "ا" کی برتری "ب" پر زیادہ دنوں قایم نہیں رہ سکتی جمہوریت اس سلسلہ کی پچھلی کڑی تھی اور اسکے بعد دوسرا قدم اشتراکیت کے سوا اور نہیں ہو سکتا خواہ ہم اشتراکیت کو وہی مخصوص معنی کیوں نہ دیں جو معاشری جمہوریت نے ظاہر ہوتے ہیں میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ان اصحاب کو جو غلط رہنمائی کر رہے ہیں اور بیجا جوش میں اندھوں کی طرح دوڑے چلے جا رہے ہیں اس طرف توجہ دلاؤں کہ منزل صرف تیز گامی سے طے نہیں ہوتی بلکہ راہ کے تعین کی بھی ضرورت ہے اور راستہ سے واقف ہونا بھی

نظیر حیدر

دُنیائے سیاست کا ایک زبردست معمہ!

(کیا روس، جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کریگا؟)

اس لڑائی میں یونتو اس وقت تک کئی منظر ایسے سامنے آئے ہیں کہ ان پر جتنی حیرت کی جائے کم ہے، لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات ہٹلر اور اسٹالین کا اتحاد و اتفاق ہے۔ جرمنی کا پولینڈ کو پندرہ دن میں فتح کر لینا، ناروے و ڈنمارک پر چند گھنٹوں میں قابض ہو جانا اور پھر فرانس ایسی بڑی سلطنت کو دس دن کے اندر مغلوب کر لینا، کم حیرت انگیز نہیں، لیکن اسٹالین کا ہٹلر کی ان اقدامات کو دیکھنا اور کچھ نہ کہنا، بلقان میں جرمنی اثرات کا بڑھتے رہنا اور روس کا ان کو گوارا کر لینا، اتنا بڑا معمہ ہے کہ دنیا اسوقت تک اسے حل نہیں کر سکی۔

جسوقت اگست ۱۹۳۹ء میں روس و جرمنی کے درمیان معاہدہ ہوا ہے اُسی وقت ساری دنیا چونک پڑی تھی کہ یہ کیونکر ممکن ہے اور جب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا تو اسے ہٹلر کی سیاست کا معجزہ کہنے لگے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ معجزہ کبھی ختم ہوگا یا نہیں؟

نازیت و اشتراکیت کا اتحاد حقیقتاً آگ پانی کا اتحاد ہے اور ہر شخص منتظر ہے کہ دیکھئے اسٹالین و ہٹلر کے درمیان کب لڑائی ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم ان دونوں کے تعلقات کی تاریخ کو سمجھ لیں، اگر ہم اس بات پر غور کر لیں کہ اسوقت تک کیا ہو چکا ہے اور روس کی پُر راز سرزمین میں اسوقت کیا ہو رہا ہے تو شاید ہم آسانی سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔

اس وقت روس کی حالت یہ ہے کہ روسی اشتراکیت کا نظام جو لینن نے قایم کیا تھا بالکل بدل گیا ہے، اس کے زمانہ کی فوج ختم ہو چکی ہے اور اسٹالین کے ہاتھ میں ساری سلطنت کی باگ ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس کا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہاں احتساب اور سنسر شپ کا یہ حال ہے کہ جب تک پروپاگنڈا کا دفتر اجازت نہ دے ایک لفظ نہ باہر جا سکتا ہے نہ اندر تمام غیر ملکی اخباروں کے نمایندے وہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور خفیہ پولیس ان کی نگرانی ہر وقت کرتی رہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ روس اسوقت کسی فریق کی طرف سے جنگ نہیں کر رہا ہے اور وہاں کوئی بات چھپانے کے قابل نہ ہونا چاہئے لیکن اس میں شک نہیں کہ اسٹالین کوئی خفیہ معاہدہ ہٹلر سے کر چکا ہے اور وہ اس کی تفصیل کی کسی کو ہوا بھی نہیں دینا چاہتا۔

اس بات کا ثبوت کہ اسٹالین اور ہٹلر کے درمیان کوئی خاص معاہدہ ہوا ہے، وہاں کی حالت سے ظاہر ہے۔ اسوقت روس کے اندر جتنے جرمن نظر آتے ہیں کبھی پہلے نظر نہ آتے تھے۔ صرف ماسکو میں اسوقت ۳۰۰۰ جرمن نامہ نگار موجود ہیں جو آزادی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں اور ان کے علاوہ اور تمام شعبوں میں کام کرنے والوں کی تعداد تو ہزاروں تک پہونچتی ہے، جو اسٹالین کے آدمیوں کے ساتھ ملکر روس کے نئے نظام حکومت میں برابر کا حصہ لے رہے ہیں۔

جب اسٹالین نے ہٹلر کے ساتھ معاہدہ کیا ہے تو اس کا ارادہ یہ نہ تھا کہ وہ جرمنی کے لوگوں کو ملک کے اندر مداخلت کا موقعہ دیگا وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ جرمن فوج سے اسے لڑنا نہ پڑے اور اس کی مدد سے یوروپ میں اس کے حدود زیادہ وسیع ہو جائیں چنانچہ سب سے پہلے ہٹلر نے اُسے پولینڈ میں جگہ دی اور پھر بالٹک ریاستوں میں۔ فنلینڈ کی طرف ہٹلر نے قصداً اسٹالین کو بڑھایا کیونکہ ہٹلر جانتا تھا کہ وہاں اسے اپنی جنگی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو جائے گا اور پھر وہ جرمنی سے زیادہ دبنے لگے گا۔ معرکۂ فن لینڈ نے روس کی حالت کو اسقدر ابتر کر دیا کہ اسٹالین مجبور ہو گیا کہ یا تو وہ خود ہی آہستہ آہستہ نازیت کو رواج دے یا پھر اس کے لئے طیار ہو جائے کہ وہ باہر سے آکر سارے ملک پر چھا جائے۔ چنانچہ اسٹالین نے پہلی صورت کو زیادہ مناسب سمجھا اور خود ہی نازی اصول کی طرف مایل ہونے لگا۔

دُنیا جانتی ہے کہ ہٹلر کتنا بڑا زمانہ شناس اور مصلحت بین شخص ہے اور اس دوران میں اسے اپنے دشمنوں کی غلطی یا حماقت کی وجہ سے فایدہ اُٹھانے کا بھی کافی موقعہ ملا۔ اُس وقت سے کہ رہائن لینڈ میں ہٹلر نے اپنی فوجیں اُتاریں، انگلستان نے ابتدائے جنگ تک متعدد غلطیاں کیں اور ہر غلطی سے ہٹلر نے فایدہ اُٹھایا۔ جب ناروے پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا تو برطانیہ کی آنکھ کھلی اور سر اسٹافورڈ کرپس کو ماسکو روانہ کیا کہ روس کو برطانیہ کی طرف مایل کر کے جرمنی سے اس کے تعلقات ختم کرا دیں، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی اور پھر بھی برطانیہ نہ سمجھ سکا کہ اسٹالین نے کیوں ہٹلر کا ہاتھ پکڑا ہے۔

جب کرپس اور اسٹالین کی ملاقات ہوئی تو اسٹالین نے پوچھا کہ "روس کس فایدہ کی توقع پر برطانیہ کا ساتھ دے؟" کرپس نے کہا "یہ وقت اس بات کے لئے بہت موزوں ہے کہ روس سلافی اتحاد کی پالیسی پر عمل کرے اور انگلستان موقع دیگا کہ رومانیا، بلغاریا اور یوگوسلیویا میں روس کا اثر قایم ہو جائے، اسی کے ساتھ مشرق بعید میں بھی روس کی پالیسی کا ساتھ دیا جائیگا اور جاپان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں پوری مدد کی جائے گی"۔

کرپس کا یہ جواب بالکل غیر دانشمندانہ تھا، کیونکہ اسٹالین سمجھتا تھا کہ بلقان میں روسی اثرات اگر پیدا ہو سکتے ہیں تو صرف جرمنی کی مدد سے اور جاپان کے معاملہ میں برطانیہ روس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ گویا کرپس کے جواب نے اسٹالین کے سامنے پھر وہی جرمنی اور جاپان کے درمیان پس جانے کے خطرہ کو پیش کر دیا۔ چنانچہ اس نے صاف جواب دیدیا کہ وہ انگلستان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کر سکتا اور اسی کے ساتھ ہٹلر سے دوسرا خفیہ معاہدہ کر لیا جس کے شرائط کا صحیح علم تو سوائے اسٹالین اور ہٹلر کے کسی کو نہیں لیکن جرمن ذرایع سے بعض باتیں ایسی مترشح ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاہدہ کا تعلق یوروپ، ایشیا اور مشرق بعید تینوں جگہ سے ہے۔

یوروپ میں تو بسرابیا اور شمالی بکوینا دیکر ہٹلر نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، لیکن وسط ایشیا اور مشرق بعید کے متعلق جو توقعات روس کو دلائی گئی ہیں وہ ابھی تک پوری نہیں ہوئیں۔

ہٹلر نے وعدہ کیا ہے کہ وسط ایشیا میں روس کو تمام علاقہ واپس دلا دیا جائے گا جو پچھلی لڑائی میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی موقعہ دیا جائے گا کہ ایران و افغانستان میں اس کے اثرات وسیع ہو جائیں۔

مشرق بعید کے متعلق ہٹلر نے وعدہ کیا کہ جاپان سے روس کا معاہدہ کرا دیگا تاکہ یہ دونوں ملکر چین کو بانٹ لیں۔

اول اول تو اسٹالین کو اس کا یقین نہ تھا کہ جاپان پر جرمنی کا اثر اتنا قوی ہو سکتا ہے کہ وہ روس کے ساتھ اس کا معاہدہ کرا دے، لیکن اس کے بعد جب جرمنی و اٹلی کے ساتھ جاپان نے بھی تین آرڈر میں شرکت کا اعلان کر دیا تو اسٹالین کو یقین ہو گیا کہ

ہٹلر کی ڈپلومیسی بہت گہری ہے اور فایدہ اسی کا ساتھ دینے میں ہے۔

روس کے نظام حکومت میں جو تغیرات اس وقت پیدا ہو رہے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسٹالین بالکل ہٹلر کے ہاتھ میں ہے یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہاں کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں جرمن کے لوگ کام نہ کر رہے ہوں اور خصوصیت کے ساتھ مشینری وغیرہ کے کام تو سب انھیں کے سپرد ہیں۔ اب دوسرے تغیرات کی فہرست ملاحظہ فرمایئے:

(۱) وہاں کی فوج میں پہلے ایک سیاسی افسر بھی رہا کرتا تھا، لیکن اب اس عہدہ کو ختم کر دیا گیا ہے اور فوجی افسران کو پورے اختیارات دیدئے گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج میں فرقہ بندی بالکل ختم ہو گئی۔

(۲) دوسرے ملکوں میں روس کے جاسوس اور خبر رساں، جرمن جاسوسوں کے ساتھ ملکر کام کر رہے ہیں اور اس طرح روس کے خفیہ محکمہ پر جرمن گسٹاپو کا قبضہ ہو گیا ہے۔

(۳) اشتراکی اصول کے مطابق ہفتہ میں صرف پانچ دن کام ہوتا تھا لیکن اب پورے سات دن ہوتا ہے اور چھٹی بند ہو گئی ہے۔

(۴) روسی محکمۂ کرد گیری کو پھر دوسرے اصول پر مرتب کیا جا رہا ہے تاکہ روس اور جرمن کے درمیان مال اور روپیہ کا تبادلہ آسانی سے ہو سکے۔

(۵) روسی فوجوں کی کمان کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ تمام آزمودہ کار افسر دور دور مقامات پر بھیج دئے گئے ہیں اس سے جرمنی پر روسی حملہ کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا۔

(۶) چودہ اور سترہ سال کے درمیانی عمر کے لڑکوں کو بالکل اسی طرح جبریہ فوجی تعلیم دیجاتی ہے جیسی جرمنی میں نازی نوجوانوں کو۔

(۷) یہ بھی انتظام ہو رہا ہے کہ پرائویٹ ملکیت یا پرائویٹ کاروبار کو پھر رواج دیا جائے لیکن حکومت کی نگرانی میں۔ اگر یہ ہو گیا تو اسکے معنے یہ ہوں گے کہ روس بالکل نازی اصول کا پابند ہو گیا اور پھر روس و جرمنی کے درمیان جنگ کا مطلق کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

یہ ہے رائے وائٹ ولیمس کی جو امریکہ کا مشہور صحافت داں اور پریسیڈنٹ روزولٹ کے نیشنل ڈیفنس ریڈیو پروگرام کا ڈائرکٹر ہے۔

ولیمس نے پیشین گوئی کی تھی کہ جرمنی زیگوسلیویکیا پر قبضہ کریگا اور وہی ہوا، اس نے کہدیا تھا کہ جرمنی ضرور لڑائی چھیڑے گا اور یہ کہنا بھی اس کا پورا ہوا۔ اس نے جرمنی کے ناروے پر حملہ کرنے کی بھی پیشین گوئی کی تھی اور وہ بھی پوری ہو کر رہی۔

اب یہ کہتا ہے کہ روس جرمنی کے خلاف اعلان جنگ نہ کرے گا۔ دیکھئے اس پیشین گوئی کا نتیجہ کیا نکلتا ہے!

جنوری ۱۹۴۱ء کے "نگار" کی بعض غلطیاں

جناب سیماب اکبرآبادی کے کلام میں حسب ذیل غلطیاں کتابت کی ہو گئی ہیں، درست فرمالیجئے:

صفحہ ۱۳۷ - سطر ۳ صحیح یوں ہے:- "گناہ ہو نہ سکے یا گناہ کر نہ سکا"
صفحہ ۱۳۹ - سطر ۶ - " " " "آزردہ اس قدر ہوں سراب خیال سے"
صفحہ ۱۳۹ - آخری سطر - " " " "یارب اسے فروغ بقدر شعور تو ہو"
صفحہ ۱۴۰ - سطر ۱۵ - آخر شعر میں سوال کا نشان غلط ہے۔
صفحہ ۱۴۰ - سطر ۱۷ - صحیح یوں ہے:- "تو اپنی بزم ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ"
صفحہ ۱۴۲ - سطر ۱۴ - " " " "آنکھ میں بھی پانوں کا انداز ہونا چاہئے"
صفحہ ۱۴۳ - سطر ۴ - " " " "یہ شورش کیوں خلاف شمع و پروانہ نہیں اٹھی"

مطبوعات موصولہ

اُردو شاعری کی مختصر تاریخ

جناب محمد جمیل صاحب ام۔ اے کی تالیف ہے اور نولکشور پریس لکھنؤ نے شایع کی ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں متعدد کتابیں اس موضوع پر نکل چکی ہیں، لیکن بہت کم کتابیں معیاری حیثیت کی شایع ہوئی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ کتاب بھی انھیں غیر معیاری تصانیف میں شامل کئے جانے کے قابل ہے اور بجائے اس کے کہ لوگوں کو اس سے فایدہ پہونچے، غلط فہمی اور گمراہی پیدا ہونے کا زیادہ اندیشہ ہے۔

مصنف نے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب اسکول اور کالج کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے زیادہ تفصیلی بحث اس میں نہیں کی گئی، لیکن اس کے یہ معنے تو نہیں ہوسکتے کہ طلبہ کے سامنے غلط چیز پیش کی جائے۔

ابتدا میں "اُردو شاعری اور اُردو زبان کی تخلیق" ایسے اہم موضوع سے بحث کی گئی ہے لیکن یہ سب کچھ سات صفحات میں آگیا ہے۔ اس کے بعد طبقہ وار شعراء کا تذکرہ اور اُن کے کلام پر تبصرہ نظر آتا ہے، جو اتنا نامکمل، اسدرجہ تشنہ اور اس قدر غلط ہے کہ طلبہ کے سامنے اسے پیش کرنا میرے نزدیک بہت بڑا اخلاقی جُرم ہے

ذاتی رائے میں اختلاف کی بڑی گنجایش ہے لیکن مسلّمات میں یہ عذر نہیں پیش کیا جاسکتا اور اس کتاب میں زیادہ تر مسلّمات ہی سے انحراف کیا گیا ہے۔

وہ شخص جو حسرت موہانی کے متعلق یہ لکھے کہ انھوں نے لکھنؤ کی زبان میں دہلی کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور ریاض کو داغ کا مدمقابل قرار دے، اس سے کیا توقع ہوسکتی ہے کہ وہ شعر و شاعری کے متعلق صحیح رائے قایم کرسکتا ہے۔

فروگزاشت کا یہ عالم ہے کہ مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خاں کے کلام پر تو تبصرہ کیا جائے، لیکن صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی، آزاد انصاری، سیماب اکبرآبادی، افسر میرٹھی اور عبدالباری آسی کا نام بھی کسی جگہ نہ لیا جائے۔ اور تو اور، آرزو لکھنوی، بیخود دہلوی سائل دہلوی اور جلیل مانکپوری کا صرف نام تو سرسری طور پر شاگردانِ داغ و امیر و جلال کے سلسلہ میں درج کردیا جائے، لیکن ان کے کلام کو قابل ذکر نہ سمجھا جائے۔

میں آیندہ اس تالیف پر ایک تفصیلی تبصرہ پیش کرکے بتاؤں گا کہ اس میں کتنی اور کس کس قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کی قیمت عہ یقیناً کم رکھی گئی ہے لیکن شاید "ارزاں بعلت" کا تقاضہ یہی تھا۔

گلبانگ حیات

جناب "امین حزیں" کے اُردو کلام کا مجموعہ ہے۔ امین حزیں کا نام قارئین نگار کے لئے نیا نہیں ہے۔ اب سے دس بارہ سال قبل آپ کے افکار اکثر نگار میں شایع ہوتے رہتے تھے اور بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

جناب حزیں صرف اقبال مرحوم کے نہ صرف ہموطن ہیں بلکہ ہم خیال بھی ہیں۔ ان کا نظریہ بھی "خودی" کی ترقی ہے اور اجتماعی ارتقار کو وہ ماحول سے زیادہ ذاتی احساس کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے فارسی میں شاعری کی اور لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے نہایت پاکیزہ اسلوب میں۔ اس کے بعد اُردو کو اظہار خیال کا ذریعہ قرار دیا اور حیات انسانی کی ترقی کے لئے وہ سب کچھ کہا جو اس دور "کج دار و مریز" میں کہا جا سکتا ہے۔

آپ کے خیالات بلند اور اندازِ بیان سلجھا ہوا ہے۔ آپ کی غزلوں میں بھی نظم کا لطف ہے اور اسی حزیں کو ہم بلا شبہ "دورِ جدید" کا پڑھا لکھا، خوش فکر و خوش فہم شاعر کہہ سکتے ہیں۔

یہ مجموعہ بہت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا گیا ہے اور اُردو اکاڈمی لوہاری گیٹ لاہور سے دو روپیہ میں ملسکتا ہے

نازو ادا دوسرے افسانے

مجموعہ ہے جناب اختر انصاری بی۔ اے کے چند افسانوں کا جسے مکتبۂ جہاں نما اُردو بازار جامع مسجد دہلی نے شایع کیا ہے

جناب اختر انصاری نے اس وقت تک چند فسانے لکھے ہیں لیکن ان کا ہر فسانہ اس "طوفان فسانہ نگاری" کے دور میں منارۂ روشنی کی طرح سب سے الگ نظر آتا ہے۔ شاعری کی طرح فسانہ نگاری کا رنگ بھی کچھ زمانہ سے بہت بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اس جدید رنگ میں بھی اختر انصاری کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے فسانوں میں علاوہ ادبی خوبیوں کے فلسفیانہ نکتہ سنجی اور نفسیاتی تجزیہ نگاری بھی پائی جاتی ہے اور ہم ان کو پڑھکر تھوڑی دیر کے لئے دُنیا کی اس سطح سے اپنے آپ کو بہت بلندی پر پہونچا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اختر انصاری کی فسانہ نگاری بے معنی ہرزہ سرائی یا داستان گوئی نہیں ہے، بلکہ اس میں فن و جذبات دونوں کا سحر کارانہ امتزاج اس قدر نمایاں طور پر نظر آتا ہے کہ اسے ہم فسانہ نگاری کا ایک علٰحدہ اسکول سمجھنے پر مجبور ہیں۔

وہ لوگ جو معیاری فسانے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے اس مجموعہ کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

مبادی سیاسیات

اس سے پہلے یہ کتاب دو حصوں میں علٰحدہ علٰحدہ شایع کی گئی تھی۔ لیکن اب دونوں حصے ملا دئے گئے ہیں یہ تصنیف جناب ہارون خاں شروانی کی ہے جو جامعۂ عثمانیہ میں شعبۂ تاریخ و سیاست کے صدر ہیں۔

سیاسیات کا مطالعہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ، انسانی زندگی کا جزو لازم ہوتا جاتا ہے اور ضرورت ہے کہ اُردو میں اس موضوع پر کثرت سے لکھا جائے اور بار بار لکھا جائے۔ جناب شروانی کی یہ کتاب تمام اُن سیاسی مسائل پر حاوی ہے جو بین الاقوامی حیثیت سے اسوقت بہت اہم سمجھے جاتے ہیں اور "نظریہ و عمل" دونوں حیثیتوں سے ان مسایل پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ اس میں بعض ان مسایل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو براہ راست موجودہ جنگ سے اساسی طور پر تعلق رکھتے ہیں اور ان تمام اسباب و حالات پر بھی گفتگو کی گئی ہے جو بین الاقوامی سیاسیات پر ہمیشہ اثر انداز ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

یہ تصنیف ماہرین و غیر ماہرین دونوں کے لئے مفید ہے۔ اس کی ضخامت ۱۰۰ صفحات ہے اور قیمت پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ جامعہ۔ قرول باغ دہلی۔

باقیات بجنوری

مجموعہ ہے ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے بعض مقالات و مکاتیب کا جسے مکتبۂ جامعہ دہلی نے شایع کیا ہے ڈاکٹر بجنوری نہایت ذہین شخص تھے اور ترقی کی بڑی اہلیت رکھتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ وہ ترقی کی منزلیں پوری کرنے سے قبل ہی، عنفوان شباب میں چل بسے۔

مرحوم کا مقالہ "محاسنِ کلام غالب" ان کی ادبی زندگی کا پہلا زینہ ہے۔ اور ہر چند اپنے اندازِ بیان اور اسلوب نقد و تبصرہ کے لحاظ سے کوئی معیاری چیز نہیں ہے، لیکن اس میں ڈاکٹر بجنوری کا ادبی مستقبل ضرور پنہاں تھا۔

اس مجموعہ میں مقالے صرف تین ہیں، ایک گیتان جلی پر، دوسرا وضع اصطلاحات پر اور تیسرا سیر لکھنؤ سے متعلق ہے۔ اور تینوں سے وہ عدم پختگی ظاہر ہوتی ہے جو ایک نوجوان ادیب کے مضامین میں پائی جانی چاہئے۔

مکاتیب کے حصہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اور "داشتہ آید بکار" میں سفر یورپ کے متعلق بعض مفید ہدایات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اخیر میں چند نظمیں بھی ہیں، لیکن سوائے اس کے کہ "یادگار بجنوری" ہونے کی حیثیت سے ان کو محفوظ رکھا جائے۔ کوئی خصوصیت ان میں نہیں پائی جاتی۔ اس مجموعہ کی قیمت ڈھائی روپیہ ہے۔

مضامین نہرو جلد اول پنڈت جواہر لال نہرو کے تیرہ انگریزی مقالوں کا ترجمہ ہے۔ جسے پنڈت انند نرائن ملا نے اُردو میں کیا ہے اصل مضامین کی حسن و خوبی کے متعلق اظہار رائے کی ضرورت نہیں اور ترجمہ کے متعلق غالباً اسقدر کہنا کافی ہے کہ وہ انند نرائن ملا ایسے خوش فکر ادیب کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

یہ کتاب انڈین پریس الہ آباد نے شایع کی ہے اور دو روپیہ میں وہیں سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

جدید جغرافیہ پنجاب لاہور سے ایک ہفتہ وار مزاحیہ اخبار شیرازہ کچھ عرصہ سے شایع ہو رہا ہے اس میں سندباد جہازی کے فرضی نام سے بڑی اچھی تنقیدیں کی جاتی ہیں، چنانچہ ۱۹۳۹ء میں پنجاب کی سیاسیات پر اسی انداز میں ایک تبصرہ شایع ہوا جو بہت پسند کیا گیا، اسی کو کتابی صورت میں اس نام سے شایع کیا گیا ہے۔

انگریزی میں اسی طرز تحریر کو (Parody) کہتے ہیں، یعنی مضحک انداز میں کسی پر تبصرہ کرنا اور اس میں شک نہیں کہ سندباد جہازی اس میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔

یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ لاہور کے اکثر ارباب سیاست کے متعلق نہایت صحیح رائے دی گئی ہے۔ یہ کتاب اُردو اکاڈیمی لاہور سے ملسکتی ہے۔

زباندانی مولوی فضل الٰہی صاحب عارف کی تالیف ہے جس میں انھوں نے بہت سے ایسے الفاظ جمع کر دئے ہیں جن کا تلفظ عام طور پر غلط کیا جاتا ہے یا جن کی تذکیر و تانیث میں لوگ غلطی کر جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے بہت سے متشابہ الفاظ بھی یکجا کر دئے ہیں اور پیشہ وروں کے اوزار، انسانوں اور جانوروں کے اعضاء، بیماریوں کی قسمیں، محاورات، پھل پھول، پودوں اور ترکاریوں وغیرہ کے نام بھی درج کر دئے ہیں۔ علاوہ ان کے اور بھی بہت سی دلچسپ و مفید چیزیں اس میں ایسی نظر آتی ہیں جنھوں نے کتاب کو بہت زیادہ کارآمد بنا دیا ہے۔ دفتر اُردو اکاڈیمی لاہور سے طلب کیجائے۔

شاہجہاں ایک ڈرامہ ہے جس میں شاہجہاں، اورنگ زیب، دارا، ممتاز محل، جہاں آرا وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے لیکن شاید اس اہتمام کے ساتھ کہ کوئی ایک واقعہ بھی اس میں صحیح درج نہ ہوگا اگر ہم تاریخی حیثیت سے قطع نظر صرف ادبی حیثیت سے اسکا مطالعہ کریں تو بھی اسی میں کوئی بات قابل توجہ نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ میاں محمد رفیق نادر ام۔ اے نے اس ڈرامہ کو لکھ کر اُردو ادب میں ایسے لٹریچر کا اضافہ کیا ہے، جسکی داد انھیں نہ پبلک سے ملسکتی ہے نہ اہل قلم سے۔ ہاشمی بک ڈپو انارکلی لاہور سے خط و کتابت کی جائے۔

(بقیہ مطبوعات موصولہ پر ماہ اپریل میں تبصرہ ہوگا)

میرے مضمون کی بعض غلطیاں

میرا ایک مضمون "سطحیات سید سلیمان ندوی" کے عنوان سے دسمبر ۱۹۴۰ء کے نگار میں شایع ہوا ہے ۔ اس میں بعض غلطیاں کتابت کی ہیں اور بعض خود ہماری چوک ہیں ۔ اس لئے ان کی صحت فرمالی جائے :۔ بعض کی تصحیح یہ ہے : صفحہ ۱۰ ۔ ۱۱۲۲ھ کی جگہ ۱۲۲۲ھ ہونا چاہئے ۔ صفحہ ۱۱ ۔ صحیح یہ ہے کہ دریائے لطافت لکھنؤ ہی میں لکھی گئی ۔ صـ۱۱ "خفیف تصرف" کے بجائے "خفیف اختلاف" پڑھئے ۔ ولی کے قطعۂ وفات کے آخری مصرعہ میں "ساغر" کی جگہ "ساقی" ہے ۔ صـ۱۲ ہاشم علی کے بارے میں اصل عبارت کچھ کی کچھ ہوگئی ہے اور بعض جگہ کاتب نگار ہماری تحریر پڑھ نہیں سکے ہیں اسلئے انھوں نے ..... اس قسم کے نشانات لگادئے ہیں، آپ عبارت یوں پڑھئے : "سید صاحب یہ صحیح نہیں فرمانے کہ ہاشم علی ولی کا معاصر تھا آخر ان کا ۱۸۱۹ء میں فوت ہوا اور ہاشم علی بارھویں صدی کے آخر میں ان دونوں کے زمانوں میں بہت فرق ہے، ایک بارھویں صدی کی ابتدا میں فوت ہوتا ہے اور دوسرا آخری لیکن سید صاحب دونوں کو ہم عصر سمجھ رہے ہیں" اسی طرح ولی اور تحقیق کی معاصرت کی جو بحث ہے اسے کالعدم سمجھئے ۔ اثر کے نام کے لئے مغربی نکات اور نکات الشعراء دیکھئے ان کا ذکر تذکرہ حسن ۔ گلزار ابراہیم اور بعض دوسرے تذکروں میں درج ہے انکی طرف رجوع کیجئے ۔ صـ۱۳، سید صاحب قبلہ کی تحقیق کے مطابق "اُردو" کا لفظ جس کتاب میں سب سے پہلی مرتبہ آتا ہے وہ تذکرہ "مخزن الغرایب" ہے راقم نے لکھا تھا کہ اس تذکرہ کا سال تالیف ۱۲۱۵ھ ہے اور پھر اس سے پہلے کی ان کتابوں کے اقتباسات دئے تھے جن میں یہ لفظ ملتا ہے، ابھی حال میں کلیات تپش کا ایک قلمی نسخہ دیکھ رہا تھا گلزار مضامین میں جس کا سال تصنیف ۱۱۹۹ھ ہے یہ لفظ بیسیوں جگہ موجود پایا : داز آنجا کہ ایں نسخہ در زبان اُردو است و زبان اُردو مرکب است ۔

صـ۲۲ "غلط" کے بجائے "کے خلاف" پڑھئے ۔ اس صفحہ پر جو چند غلطیاں ہیں وہ سید صاحب کی نہیں ۔ "یادگار عشق" کے مرتب کی ہیں درمیان تحریر میں اس کا نام آگیا تو ان باتوں کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوا اور یوں زیادہ کہ سید صاحب نے اس کتاب کی بعض غلطیوں کی تصحیح کی ہے اور ان سبھوں کی نہیں اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ سید صاحب ان بیانات کو صحیح مانتے ہیں ۔ صـ۲۵ پر چھپ گیا ہے کہ "لطف استر آباد کے رہنے والے تھے نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے" یہ اصل میں یوں ہے : "لطف کے والد ہجری استر آبادی کے ..... " پروفیسر شروانی نہیں بر فیر شیرانی صحیح ہے "ہمارے خیال میں" میری مراد معین الدین سے ہے" نہیں بلکہ "ہمارے خیال میں میر کی مراد معین الدین سے ہے" مولانا عبدالحی تذکرۂ سودا کے قایل نہیں قایل مولانا عبدالحق (بی ۔ اے) ہیں ۔ اسی قسم کی کچھ اور کتابت کی غلطیاں ہیں لیکن وہ ایسی ہیں کہ صاحب ذوق خود تصحیح کرلیں گے ۔

یہ سطریں ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھیں کہ رسالہ "ندیم" گیا کا جنوری نمبر ملا، ملاحظات پڑھکر حیرت ہوئی، غصہ و اضطراب میں صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے گئے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ غایت کا درجہ بجرانی حالت میں لکھا گیا ہے ۔ وہ حد درجہ برافروختہ ہیں کہ سید سلیمان ندوی کے مقالات پر تنقیہ کیوں لکھی گئی ۔ حالانکہ خفا ہونے اور گالیاں دینے کے بجائے وہ اگر نفس مضمون کا جواب دیتے تو زیادہ اچھا تھا، ہمارے ایک اعتراض کا جواب دیا بھی ہے تو حد درجہ بھونڈا ۔

سید سلیمان ندوی نے دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۱۲۲ھ بتایا تھا، ہم نے لکھا تھا کہ یہ سن تکمیل[1] ہے ۔ کتاب کی ابتدا شاہ عالم کی زندگی ہی میں ہوچکی تھی جن کا سال وفات ۱۲۲۱ھ ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے ہی دریائے لطافت کا دھارا بہ نکلا تھا، آپ فرماتے ہیں : مضمون نگار نے دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۱۲۲ھ لکھا تھا یا یہ لکھا تھا کہ اس تصنیف کا آغاز ۱۱۲۲ھ میں ہوا" اب انھیں کون سمجھائے کہ جو کتاب کئی برس میں لکھی جاتی ہے اس کا سال تصنیف بتانے کی تین صورتیں ہوتی ہیں، یا سال آغاز تصنیف یا سال تکمیل یا یہ کہ فلاں سنہ سے شروع ہوکر فلاں سنہ میں ختم ہوئی ۔ وہ تو ندوہ کے فارغ ہیں ان سے اگر کوئی پوچھے کہ بخاری شریف (جو ۲۳ برس میں لکھی گئی) کا سال تالیف کیا ہے تو وہ کیا بتائیں گے، تعجب ہے وہ اتنی سیدھی سی بات نہیں سمجھتے ۔ حیرت ہے کہ وہ مورخ ہوکر بھی سنین کی غلطیوں کو اہمیت نہیں دیتے ۔ سید سلیمان ندوی اور انکے احباب کو چاہئے کہ ہمارے اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کریں ورنہ ظاہر ہے کہ گالی گلوچ میں میں انکا حریف نہیں ۔

م ۔ ا

[1] میر نے "سن تکمیل" پر اعتراض کیا ہے ۔ اعتراض ان کے علمی مطالعہ کا نتیجہ ہے ۔ بجز شاگرد ناسخ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

سبق میں نے پڑھا استاد سے جس روز ابجد کا — کھلا یکم محرم سے سن مبعوث احمد کا

بچّوں کے لئے دماغی تفریح

چند ٹکڑوں کی ترتیب

ذیل کے سیاہ ٹکڑوں کو ترتیب کے ساتھ جوڑنے سے انگریزی کا حرف M بنتا ہے۔ کسی دوسرے کاغذ پر ان ٹکڑوں کی نقل کر کے قینچی سے کاٹ لو اور انھیں جوڑ کر M بناؤ:

۹ کا ہندسہ

سب سے پہلے جس کا جواب آئے گا اسے "جذبات بھاشہ" کی ایک جلد مُفت دیجائے گی

اگر اعداد کی نقل کرتے وقت ان کی ترتیب میں غلطی ہو جائے تو اس غلطی سے جتنے اعداد گھٹیں گے وہ ضرور ۹ کے ہندسہ سے تقسیم ہو جائیں گے مثلاً:

صحیح اعداد		غلط اعداد	
۷۸۴۱		۷۸۱۴	
۱۶۹۱۸		۱۶۹۸۱	
۳۴۱		۳۴۱	
۷۹۶۳		۷۹۶۳	
۱۲۸۲۱۶		۱۲۸۶۲۱	
۷۲۴		۷۲۴	
۱۲۲۰۰۲۵۱۱		۱۲۲۱۲۵۱۱۰	

اب ایک کو دوسرے سے گھٹاؤ تو باقی ۱۴۴ بچیں گے جو ۹ پر برابر تقسیم ہو جائیں گے۔ اسی قسم کی اور مثالیں بنا کر تجربہ کرو۔

تم بھی غور کرو

اگر تمھیں دیا سلائی کی تین تیلیاں دیدیجائیں اور کہا جائے کہ ان کو اس طرح رکھو کہ چار مثلث برابر کے بن جائیں تو تم کو تعجب معلوم ہوگا کہ یہ کیونکر ممکن ہے لیکن غور کرو تو تمھاری سمجھ میں آجائے گا کہ یہ ناممکن نہیں ہے۔ جو بچے اس کا صحیح جواب دیں گے اُنھیں کتاب "شاعر کا انجام" مُفت دیجائے گی۔ آیندہ مہینے کے نگار میں اس کا حل شایع ہوگا۔

جادو کے مربعے :

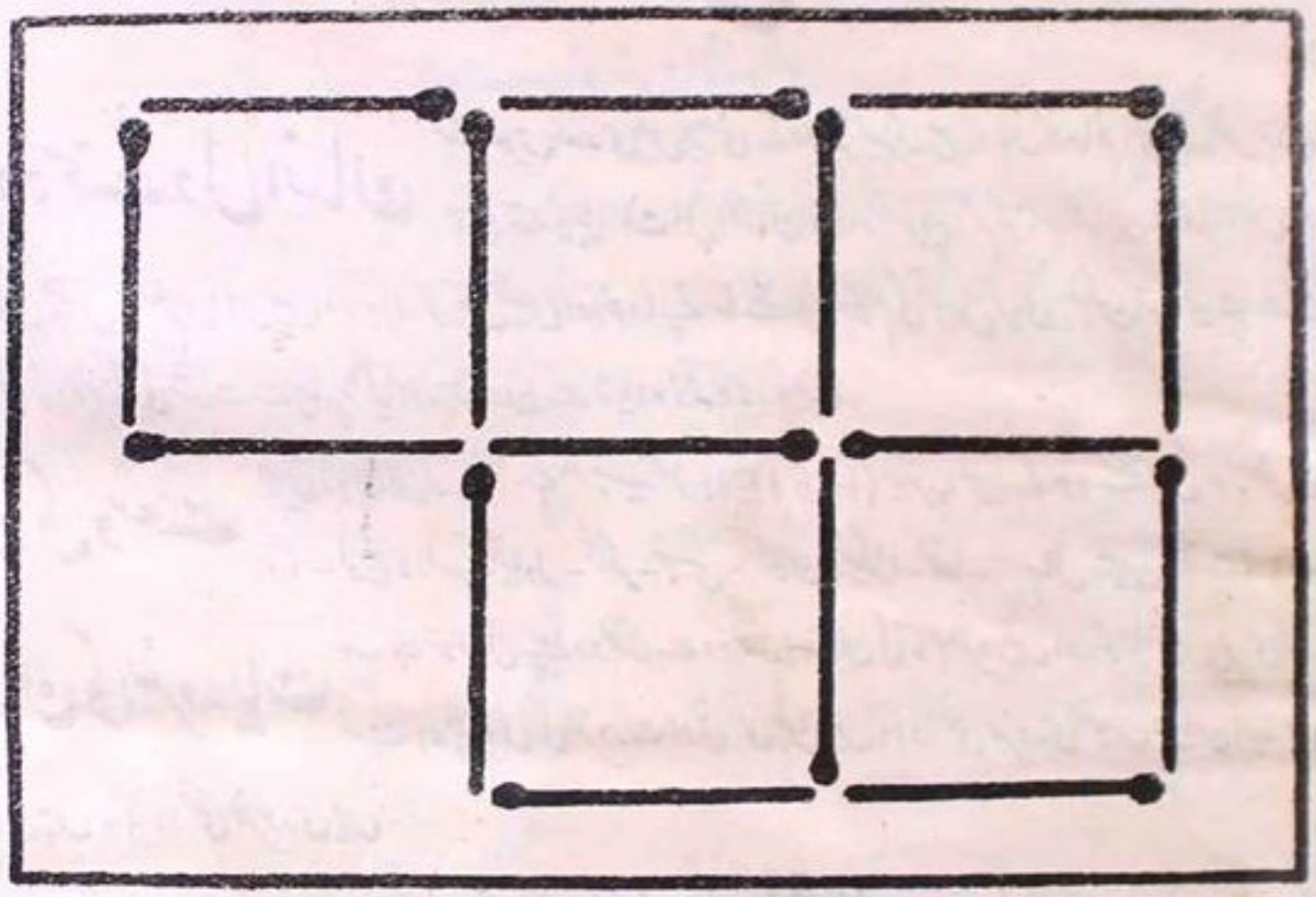

دیا سلائی کی پندرہ تیلیاں لیکر اگر انھیں نقشۂ بالا کی طرح رکھو گے تو پانچ مربعے بن جائیں گے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ان میں سے تین تیلیاں نکال لو اور تین مربعے باقی رہیں۔

سب سے پہلے جس کا صحیح جواب ملے گا اسے "اُردو ٹکٹ" کا ایک پیکٹ مُفت دیا جائے گا۔ اس کا حل بھی آیندہ نگار شایع ہوگا۔

کارٹون

سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی دُعا

اے اللہ، تیرا شُکر ہے کہ تو نے
یہ لڑائی نازل کر دی، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ
یہ جلد ختم ہو جائے

کشکول

سب سے زیادہ سخت دل انسان

سترھویں صدی میں جرمنی کے علاقہ لیبزگ میں وہاں کا حاکم اعلیٰ ایک شخص بنڈیکٹ کابزوف نامی تھا۔ یہ بڑا سخت دل انسان تھا اور کسی پر رحم کرنا جانتا ہی نہ تھا، اس نے اپنی زندگی میں ۳۰ ہزار آدمیوں کو قتل کا حکم دیا جن میں ۲۰ ہزار عورتیں تھیں اور خود اپنے سامنے ان احکام کی تعمیل کرائی۔ لیکن آپ حیرت سے سنیں گے کہ جب اس کا کتا مر گیا تو وہ رنج کی شدت سے بیمار پڑ گیا اور چند دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔

چینی زبان کی وسعت

چینی زبان کا ایک لفظ ہے "ہسیہ" (HSIEH) لیکن اس کے ۲۴ معنے ہیں۔ بعض یہ ہیں: جوتا۔ فوج کا افسر۔ قبیلہ۔ لشکر۔ ہنسی۔ تکان۔ کیکڑا۔ کتھا۔ اسہال۔ لہسن۔ مملکت۔ سردار۔ ہڈی۔ ہتھیار

موجودہ انسان کی ضروریات

اب سے سو سال پہلے دولتمند سے دولتمند انسان کی تمام ضرورتیں اور خواہشیں پوری کرنے کے لئے صرف ۲۰ چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی جن میں ۱۶ واقعی ضروری تھیں، لیکن اب ۴۸۴ چیزیں درکار ہوتی ہیں جن میں ۹۴ واقعی ضروری ہیں۔

اسی طرح سو سال پہلے بازار میں صرف ۲۰۰ چیزیں تھیں جن کی تجارت کی جاتی تھی لیکن اب ان کی تعداد ۳۲ ہزار ہے اور جن چیزوں سے یہ اشیاء طیار ہوتی ہیں ان کی تعداد ۳ لاکھ ۶۵ ہزار تک پہونچتی ہے۔

ایک لطیفہ

مشہور ہے کہ عورتیں اپنی عمر صحیح نہیں بتاتیں، خاصکر یورپ کی عورت تو اس کو بہت چھپاتی ہے۔ ایک بار کوئی عورت سڑک پر جا رہی تھی کہ موٹر کا دھکا لگا اس کی ناک زخمی ہوگئی۔

اس نے عدالت میں دعویٰ کیا کہ موٹر والے سے معاوضہ دلایا جائے کیونکہ اسکی ناک بدنما ہوگئی ہے۔ عدالت نے بھی اسکو منظور کر لیا، لیکن موٹر والے نے کہا کہ "میں معاوضہ دینے کو طیار ہوں، لیکن معاوضہ کی رقم معین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس عورت کی صحیح عمر معلوم کی جائے، کیونکہ ایک جوان عورت کی ناک کی جو قیمت ہوگی وہ ادھیڑ عورت کی ناک کی نہیں ہو سکتی۔

عدالت نے بھی اس سے اتفاق کیا، لیکن عورت یہ سنکر دعویٰ سے دستبردار ہوگئی تاکہ اس کو اپنی صحیح عمر کی تصدیق نہ کرانا پڑے۔

بعض دلچسپ اقوال

عورت شادی کرتی ہے تو دُنیا میں داخل ہوتی ہے اور مرد شادی کرتا ہے تو دُنیا چھوڑ دیتا ہے۔

نصرانیت سے خدا اور مذہب کا تصور علٰحدہ کر دو تو وہ اشتراکیت ہے۔

ہم میں سے ہر شخص تماشا ہے یا تماشائی۔

جو بہت جانتا ہے وہی زیادہ شک میں مبتلا ہوتا ہے ——— زیادہ سوچنا ہمیشہ صحیح نتیجہ تک نہیں پہونچتا۔

آزادی کسی قوم پر اوپر سے نہیں اُترتی، بلکہ خود ایک قوم ترقی کر کے اُس تک پہونچتی ہے۔

آزادی کے معنے یہ نہیں کہ انسان جو چاہے کرے، بلکہ وہ صرف وہ کرے، جو اسے کرنا چاہئے۔

اگر انسان بہشت میں قید کر دیا جائے تو بہشت بھی دوزخ سے کم نہیں۔

ضمیر کی آواز

(دُشمنانِ نیاز سے)

ہر چند کہ نعمت ہے طبیعت کی بلندی
میں اپنی طبیعت کی بلندی سے ہوں بیزار

دُنیا کو نہیں ایسی طبیعت کی ضرورت
جو آگ کے شعلوں کو سمجھتی نہیں گلزار

کیونکر خس و خاشاک کو میں پھول سمجھ لوں ؟
ہے کیا خس و خاشاک کے دامن میں بجز خار ؟

کرتا تھا کبھی میں بھی حقیقت سے کنارا
دُنیا مرے قدموں پہ بھی رہتی تھی نگوں سار

آخر نہ ہوئی مجھکو گوارا یہ دو رنگی
فطرت ہی مری مجھسے ہوئی بر سرِ پیکار

ہونے لگے "آزادی گفتار" کے چرچے
تحریر میں پائے گئے "الحاد" کے آثار

"اپنے بھی خفا مجھسے ہیں بیگانے بھی ناخوش"
یعنی کہ ہوں آزادی فطرت کا گنہگار

جو دیکھ رہا ہوں اُسے لاتا ہوں زباں پر
اس بات پہ بگڑے ہیں قدامت کے طرفدار

اے مفتی دیں ! کیا اُسے پرکھا بھی ہے تونے ؟
جس شخص کو سمجھا ہے غلط بیں و سیہ کار

اُس ذہن کے پردے میں نہاں اور ہی کچھ ہے
جو ذہن نہیں "وہم" کی لعنت میں گرفتار

آنا ہے ابھی تجھ کو تو میدانِ عمل میں،
ہونی ہے ابھی مجھ سے تو تزئینِ "سر دار"

محبؔ عارفی۔ بی۔ اے (علیگ)

غزل : شادؔ عارفی

وہ مسکرا دئے جو میری اولیں نگاہ پر
تم روشنی سی پڑ گئی امیدِ رسم و راہ پر

کئی گناہ نفسِ مطمئن کے ساتھ ساتھ ہیں
اُبھارتا ہے نفسِ مطمئن کئی گناہ پر

جہاں نہیں ہے رہنما وہاں ہے آسرا خدا
بھٹک گئے جو راہ سے وہ آگئے ہیں راہ پر

نباہتا نہیں کسی سے "وقتِ غیر مستقل"
قسم نہ لیجئے نہ زور دیجئے نباہ پر

خودی کی موت ہے "عطائے ناسزا" پہ ریجھنا
شراب تک نہ لے اگر ملے خدا کی راہ پر

جھکی ہوئی ہے شاخِ کہکشاں فرازِ بامِ چرخ تک
چمن سمٹ کے چھا گیا ہے اُسکی خواب گاہ پر

وہ انجمن میں شادؔ آج پیش آئے اس طرح
فقیر کے قدم ہوں جیسے فرقِ بادشاہ پر

جواب تغافل

اُس کو ہلکا سا ہے احساسِ جوانی کا سرور
ہے کلی غنچے کے مفہوم سے کچھ دور ابھی
گیسوئے سادہ سے ہے دور تکلّف کا خیال
نرم ہونٹوں کی لکیروں میں نہیں آگ ابھی
چشمِ مے رنگ میں شامل نہیں سینے کی کھٹک
ابھی رفتار میں گرداب کا انداز نہیں،
ساز کا برق فگن تار ہے خاموش ابھی
نقشِ فطرت کا ہے ابہام سے لبریز ابھی،
سُست رفتاریِ فطرت کا مدادا کردوں
وقت سے پہلے اُسے اُس کی جوانی دیدوں
اُس کے اعضا میں جو طوفاں ہیں جگادوں اُنکو
اپنے جلتے ہوئے لب اُس کے لبوں پر رکھ کر
ڈال کر اپنی جنوں خیز نگاہیں اُس پر
ابھی چمکی نہیں نخوت ابھی سوتا ہے غرور
جامِ صہبائے جنوں سے نہیں معمور ابھی
کھل کے پھیلا نہیں زلفوں کی سیہ رات کا جال
قدِ رعنا میں ہے بنتا ہوا اک راگ ابھی،
ناشناسائے جنوں ہے ابھی سانسوں کی مہک
دل کی گہرائی کوئی شاملِ آواز نہیں،
رو میں طوفان ترنم کے نہیں جوش ابھی
سطح پر آئی نہیں موجِ جنوں خیز ابھی
یعنی اُس موج کو ہم فطرتِ دریا کردوں
اُس کے انفاس کو شعلے کی روانی دے دوں
تارِ احساس کے جتنے ہیں ہلا دوں اُن کو،
اُس کے خاموش خیالوں میں اُٹھا دوں محشر
کھول دوں گرمیِ جذبات کی راہیں اُسپر

سادہ پانی میں ملا کر ذرا تھوڑی سی شراب
دے ہی دوں فطرتِ بے جس کے تغافل کا جواب

عدم

غزل : جگر بریلوی

جو نبھ سکی نہ کسی سے وہ چاہ ہے تیری
اجل کی راہ سے دشوار راہ ہے تیری
ہزار لالہ و گُل کے پڑے رہے پردے
رہی جو دل میں اُتر کر نگاہ ہے تیری
نصیب سے میرے پہلو میں دل نکل آیا،
وگرنہ دور بہت بارگاہ ہے تیری
جہاں اجل کو بھی راحت کی نیند آتی ہے
وہ آستاں ہے تیرا وہ پناہ ہے تیری
اسی پہ ترکِ محبت کا زعم تھا اے دل
کہ ابتو اور بھی حالت تباہ ہے تیری
قدم وفا میں جو رکے ہے ڈگمگانے سے
وہ ایک سرزنش گاہ گاہ ہے تیری

اِسی میں غرقِ خودی اور بیخودی سب ہے
جگر کے دل میں محبت اتھاہ ہے تیری

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے قیمت تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعۂ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۲۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل شوق نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)
خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-
۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ
۲- مادیین کا مذہب۔
۳- حرکت کے کرشمے۔
نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شایستگی اسکی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (۲ر)
علاوہ محصول

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن پورٹ سوڈان جدّہ و سوئز کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

بمبئی اور کراچی سے عدن جدّہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں پیز پورٹ لوئی مارشیس تک مسافروں اور باربرداری کی سروسیں۔

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں۔

تفصیلات کے لئے خط وکتابت کیجئے۔

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بنک اسٹریٹ بمبئی

مطبوعہ بخارا پرنٹنگ ورکس نیا گاؤں کمپنی (پرنٹرز پبلشرز) بمبئی